

حیات سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

مشہور صحافی جناب سلامت رضوی صاحب

باعث مکمل کتاب ایک ساتھ پیش نہیں کی جاسکی لیکن انشاء اللہ بہت جلد سرکار کے افکار اور کارناموں کے تجزیہ اور تشریح کے لیے چند جلدوں میں ایک مکمل کتاب سامنے آئے گی۔

۱۲/ جون ۱۹۸۸ء / شوال ۱۴۰۸ھ

سلامت رضوی، ڈالی گنج لکھنؤ

پیش لفظ

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ اس صدی کے وہ عظیم عالم تھے جو ہندوستان کے جاہل ماحول میں ناشناختہ رہے، ان کی مجمع الصفات ذات ہمارے دور کے علمائے احسن اور صاحبانِ علم و کمال کے لیے تو محتاج تعارف نہیں لیکن عوام الناس کو بعض مفسد اور مفاد پرست عناصر نے ان کے کارناموں سے آشنا نہیں ہونے دیا۔ سرکار کے کارناموں کی عظمت کے بارے میں مستقبل کا مورخ خود فیصلہ کرے گا، لیکن اس وقت ان کی حیات اور کارناموں کا یہ مجمل خاکہ پیش کیا جانا ضروری ہے تاکہ نا آگاہ دنیا محسوس کر سکے کہ سرکار کی ذات کیسی عظیم نعمت تھی جس کی قدر نہیں کی گئی۔

سید العلماء اکادمی کا قیام اسی غرض سے کیا گیا ہے کہ نہ صرف سرکار کی حیات اور کارناموں سے ناواقفین کو متعارف کرایا جاسکے بلکہ معارفِ علوم اسلامی اور مقصدِ حسینیت کی تبلیغ کے کارِ عظیم کو آگے بڑھایا جاسکے جو سرکار کا واحد نصب العین تھا۔ اس سلسلے میں یہ اکادمی اور امامیہ مشن دونوں اپنا فرض پورا کریں گے۔

سرکار کے کارناموں کے تفصیلی بیان کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تنگی وقت کے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّاهِرِیْنَ۔

خصوصیاتِ نسب

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب خاندان جناب غفرانمآب کی ایک ممتاز فرد تھے۔ نسلِ غفرانمآب ہندوستان و پاکستان دونوں میں خاندانِ اجتہاد کے نام سے مشہور ہے، اس لیے کہ جناب غفرانمآب پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے سلسلہ مجتہدین کی ہندوستان میں بناء ڈالی تھی اور ان کی نسل میں ان کے وقت سے اس وقت تک برابر ہر دور میں علماء و فقہاء کا سلسلہ جاری ہے اور شیعہ دنیا کی مذہبی قیادت اس سلسلے کے افراد کرتے رہے ہیں۔

خاندانِ اجتہاد کے اکثر ممتاز صاحبانِ علم سلسلہ مادی سے اس خاندان سے منسلک ہیں اور بعض افراد دوھیال کی

صاحب کی دختر تھیں اور خلاصۃ العلماء جناب غفرانمآبؒ کے بڑے بیٹے جناب سلطان العلماء کے صاحبزادے تھے۔ اس طرح سید العلماء کے نانا بھی خاندان اجتہاد ہی کی ایک فرد تھے۔

پانچواں سلسلہ

سید العلماء کی نانی نواب مہدی حسین ماہر کی صاحبزادی تھیں۔ وہ زین العلماء مولانا سید علی حسین صاحب ابن سید العلماء مولانا سید حسین ابن غفرانمآبؒ کے فرزند تھے۔

اس طرح جناب غفرانمآبؒ کی اولاد میں جو دو عظیم شاخیں تھیں، ایک جناب سلطان العلماء کی اولاد جو بڑی حویلی کہلاتی تھی، اور دوسری جناب سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکان کی اولاد جو چھوٹی حویلی کہلاتی تھی، ان دونوں کا اجتماع سرکار مرحوم میں ہو گیا تھا۔ پہلے، دوسرے اور پانچویں تین سلسلے جناب غفرانمآبؒ کے چھوٹے فرزند سید العلماء تک پہنچتے ہیں اور تیسرے، چوتھے دو سلسلے جناب سلطان العلماء تک پہنچتے ہیں جو حضرت غفرانمآبؒ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

ان دونوں شاخوں کے خصوصیات امتیازی الگ الگ تھے۔ اگرچہ تعلیمی حیثیت سے دونوں سلسلوں کے افراد تمام علوم متعارف میں انتہائی درجات کے حامل تھے لیکن رجحان طبع کے لحاظ سے چھوٹی حویلی یعنی جناب سید العلماء کی اولاد فقہ و اصول میں جو اصل معیار اجتہاد ہے، شہرت رکھتی تھی اور بڑے قبلہ و کعبہ جناب سلطان العلماء کی نسل کے علماء معقولات اور علم کلام میں امتیاز خاص کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی مرحوم میں یہ دونوں نسلیں بہم متصل ہوئیں اس لیے قدرت نے ان متفرق کمالات کو ان کی ذات میں یکجا طور پر مجتمع کر دیا۔ جیسا کہ تفصیل کے ساتھ درج ہوگا، وہ فقہ و

طرف سے نسل جناب غفرانمآبؒ میں ہیں، لیکن جناب سید العلماء دوھیال اور نخیال دونوں طرف سے نسل غفرانمآبؒ سے تھے۔ تعداد کے لحاظ سے جتنے سلسلوں سے آپ کا نسب جناب غفرانمآبؒ تک پہنچتا ہے اس میں کمتر ہی کوئی آپ کا ہم پلہ ہوگا۔ آپ کا نسب پانچ مختلف سلسلوں سے جناب غفرانمآبؒ تک منتهی ہوتا ہے جس کی تشریح حسب ذیل ہے:

پہلا سلسلہ

دوھیالی لحاظ سے سرکار سید العلماء اور جناب غفرانمآبؒ کے درمیان صرف چار کڑیاں ہیں۔ سید العلماء کے والد جناب ممتاز العلماء ابوالحسن عرف مثنیٰ صاحب قبلہ تھے۔ جو جناب سید العلماء مولانا سید ابراہیم صاحب کے فرزند تھے وہ جنت مآب سید تقی صاحب کے فرزند تھے جو حضرت غفرانمآبؒ کے چھوٹے بیٹے سید العلماء مولانا سید حسین صاحب کے فرزند گرامی تھے۔ اس سلسلے کی ہر فرد اپنے دور کی جید مجتہد تھی، جس کی تفصیل عنقریب درج ہوگی۔

دوسرا سلسلہ

سید العلماء کی دادی، جناب زبدۃ العلماء سید علی نقی صاحب کی صاحبزادی تھیں جو سید العلماء سید حسین صاحب ابن جناب غفرانمآبؒ کے فرزند تھے۔

تیسرا سلسلہ

سید العلماء کی دادی کی والدہ منصف الدولہ سید محمد باقر صاحب کی صاحبزادی تھیں جو جناب سلطان العلماء ابن جناب غفرانمآبؒ کے بڑے فرزند تھے۔

چوتھا سلسلہ

سید العلماء کی والدہ سید محمد صطفیٰ عرف لدن صاحب خورشید کی صاحبزادی تھیں جو خلاصۃ العلماء مولانا سید مرتضیٰ

تصانیف:

اساس الاصول، عماد الاسلام، شہاب ثاقب،
منتہی الافکار، ذوالفقار، صوارم الالہیات، حسام
الاسلام، رسالہ غیبت، رسالہ ارضین، رسالہ ذہبیہ،
رسالہ درر دنصاری، احیاء السنۃ، خاتمہ کتاب صوارم،
مواعظ حسینیہ، شرح باب الصوم، شرح باب الزکوٰۃ،
حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ، اثارۃ الاحزان، مسکن
الفواد، حاشیہ ملاحمد اللہ اور مطارق۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ جناب غفرانمآب نے ملک
میں عزائے حسین علیہ السلام کو فروغ دیا، بالخصوص لکھنؤ میں
عزائے سید الشہداء کی ترقی حضرت غفرانمآب اور نواب
آصف الدولہ کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے۔

آپ نے ایک امام باڑہ لکھنؤ میں اور دوسرا اپنے وطن نصیر
آباد میں تعمیر فرمایا۔ آپ ہی کی اقتداء میں شیعوں کی سب سے
پہلی جماعت لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ سرزمین لکھنؤ پر پہلا کتب
خانہ آپ ہی نے قائم کیا۔ جناب غفرانمآب نے روضہ حضرت
سید الشہداء علیہ السلام کی تعمیر میں حصہ لیا اور علمائے عراق کے
لیے زرو مال کی ترسیل فرمائی۔ یہ وہ پہلا قدم تھا جس کو ان کی اولاد
نے بلند تر معیار تک پہنچایا۔ تلامذہ جناب غفرانمآب کی فہرست
بھی بہت طویل ہے جو علوم وفنون متداولہ میں ممتاز تھے۔

۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ کو ۶۹ سال کی عمر میں انتقال کیا اور
لکھنؤ میں اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔

(۲) سلطان العلماء، مولانا سید محمد

رضوان مآب

جناب غفران مآب اعلیٰ اللہ مقامہ کے پانچ فرزندوں
میں آپ سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۷۷ صفر

اصول میں ان امتیازات کے مالک ہوئے جو ان کے پدری
سلسلے کا تقاضا تھا اور علم کلام اور معقولات میں بھی وہ کارہائے
نمایاں انجام دیئے جو ان کے والد کے ننھیالی
سلسلوں کا تقاضہ تھا۔ اس کے ساتھ مزید آپ میں خود اپنی
ننھیال کے دو بزرگوں یعنی جناب ماہر اور جناب خورشید سے
ورشہ میں شعر و ادب کا ملکہ حاصل ہوا اور اس طرح آپ ایسے
مجمع کمالات بن گئے جس کی مثال اس سے پہلے کسی ہندوستانی
مجتہد اعظم میں دیکھنے میں نہیں آئی اور ایران و عراق بلکہ پوری
تاریخ شیعہ میں انگشت شمار عالم اس طرح جامع علوم و ادب
ہوئے ہیں۔

اب ہم آپ کے والد علم اور جناب غفرانمآب تک دوسرے
اجداد کے کارناموں اور مقامات کا مجمل تذکرہ کرتے ہیں۔

سرکار سید العلماء کے عظیم المرتبت اجداد

(۱) مولانا سید دلدار علی غفرانمآب

آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۶۶ھ میں قصبہ نصیر آباد
ضلع رائے بریلی میں ہوئی۔ مختلف شہروں میں تعلیم حاصل کی۔
نواب آصف الدولہ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے عراق بھیجا۔ وہاں
عظیم المرتبت علماء سے درس لیا اور اجازہ اجتہاد لے کر
۱۱۹۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور مذہب امامیہ کے
فروغ کی جانب توجہ فرمائی، کیونکہ اس وقت ملک میں تصوف
اور وہابیت کے غلبے کا دور تھا، جناب غفرانمآب نے ان کی رد
میں مختلف کتابیں لکھیں اور نہایت انہماک کے ساتھ فقہ،
اصول فقہ اور کلام پر اعلیٰ کام کیا۔ ان میں ان کی کتاب ”عماد
الاسلام“ اور علم کلام میں ”حسام الاسلام“ سب سے عظیم تصنیف
ہے۔ یوں تو آپ کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے لیکن
درج ذیل کتب نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔

۱۱۹۹ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد کے بعد مسند اجتہاد پر رونق افروز ہوئے اور بڑی منزلت حاصل کی، سلطان اودھ کو آپ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ آپ قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ آپ ہی کی کوششوں سے بادشاہ نے ایک مدرسہ قائم کیا اور تمام اطراف ملک میں مفتی مقرر کئے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سید محمد باقر صاحب سے جن کا خطاب صفوة العلماء اور منصف الدولہ تھا، محکمہ دیوانی اور آبکاری متعلق ہوا۔ محکمہ پولیس اور فوجداری دوسرے صاحبزادے خلاصۃ العلماء مولوی سید محمد مرتضیٰ کے سپرد ہوا۔ سلطان العلماء نے ۱۲۸۴ھ میں انتقال فرمایا اور حسین غفران مآب میں دفن ہوئے۔ انتقال کے بعد رضوان مآب کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

سیف ماسح (در اثبات حکم مسح رجلین)،
حاشیہ بر شرح سلم العلوم ملا حمد اللہ، اصل اصول
در رد اخبار ثین، حاشیہ شرح صغیر، ضربت حیدریہ،
صمصام قاطع، طعن الرماح (در قصہ فدک) ثمرۃ
الفوائد، سم الغار، عجالة نافعہ، برق خاطف، شرح
زبدۃ الاصول، فوائد نصیریہ، کشف الغطاء، رسالہ
(در نماز جمعہ)، گوہر شاہوار، احیاء الاجتہاد،
سبع المثانی، بوارق موبقہ، التصبیق والوسعة فی
القضاء، بشارات محمدیہ، رسالہ (در تحقیق عدم
نجاست عرق جنب بحرام)

(۳) سید العلماء مولانا سید حسین علیین

مکان

جناب غفران مآب کی اولاد میں سب سے چھوٹے تھے،
آپ کی ولادت باسعادت درحقیقت معصوم کی بشارت پر ہوئی

تھی۔ جناب غفران مآب نے اپنی تمام اولاد کا نام حضرات
معصومین کے اسمائے مبارکہ کی ترتیب کے مطابق رکھا تھا
چنانچہ سب سے بڑے فرزند حضرت سلطان العلماء کا نام سید محمد،
ان سے چھوٹے کا نام سید علی پھر سید حسن اور اس کے بعد خلاف
ترتیب سید مہدی نام رکھا تو خواب میں حضرت سید الشہداء امام
حسین علیہ السلام کی زیارت کی، کہ وہ فرماتے ہیں کہ تم نے پہلے
ترتیب کا لحاظ کیا، مگر اس فرزند کے نام میں اس سے قطع نظر کر لی
اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے عرض کیا کہ یہ فرزند اس وقت پیدا
ہوا کہ جب مجھ پر پیری غالب آچکی ہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اس
کے بعد کوئی دوسرا فرزند ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ خیال
درست نہیں، تمہارے یہاں ایک اور فرزند ہوگا اس کا نام میرے
نام پر رکھنا۔ اس خواب کے بعد ۱۲ رجب الثانی ۱۲۱۱ھ کو جناب
سید العلماء کی ولادت ہوئی اور آپ کا نام سید حسین رکھا گیا۔

ذکاوت و ذہانت اور شوق علم کا نتیجہ یہ تھا کہ ۷ سال کی
عمر میں تمام علوم و فنون میں فارغ ہو کر درجہ اجتہاد کو حاصل
کر لیا۔ جناب سید العلماء منطق و فلسفہ، ہیئت و حساب، ادب و
کلام، حدیث و تفسیر، فقہ و اصول فقہ، تاریخ، اقلیدس، معانی و
بیان، صرف و نحو، غرض تمام علوم متداولہ میں بحر بے کراں تھے
آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

مناہج التدقیق (فقہ استدلالی)، روضۃ
الاحکام، الافادات الحسینیہ، الحدیقۃ السلطانیہ،
امالی (فی التفسیر والمواعظ)، مجالس مفعیہ،
وسیلۃ النجاة، حاشیہ (علی الریاض)، تعلیقات (علی
شرح ہدایۃ الحکمة)، رسالہ (اصالة الطہارۃ)، رسالہ
(در حقیقت و منقول)، رسالہ (در میراث)، رسالہ
(در تجوید)، اجازات، رسالہ (در مسئلہ شک)

جناب سلطان العلماء طاب ثراہ ایک تحریر میں ممدوح کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”والد ماجد غفر انما آب کی اولاد میں سے انہی علیین مکان مولوی سید حسین طاب ثراہ جامع علوم عقلی و نقلی اور حاذق علوم دینی مانند تفسیر اور حدیث اور فقہ و اصول میں ایسے ہیں کہ قریب ایک ہزار شاگردان کے ہندوستان میں موجود ہوں گے۔“

(تاریخ، سلطان العلماء)

باسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۷۳ھ میں آپ نے انتقال کیا حسینہ غفران مآب میں دفن کئے گئے۔ وفات کے وقت سلطان وقت نے علیین مکان لقب دیا۔

(۴) جنّت مآب مولانا سید محمد تقی (مہتا ز العلماء)

(پیدائش: ۱۶ جمادی الاول، ۱۲۳۳ھ) آپ جناب غفر انما آب کے پوتے اور علیین مکان مولانا سید حسین عرف میرن صاحب کے بھٹے بیٹے تھے ”ممتاز العلماء“ اور ”فخر المدرّسین“ خطاب تھا۔ انتقال کے بعد جنّت مآب کے لقب سے ملقب ہوئے۔ رمضان المبارک ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔

چونکہ آپ کے والد جناب سید العلماء کا زیادہ وقت حکومت کے دینی امور کی نگرانی میں صرف ہوتا تھا اور ان کا دائرہ عمل طلباء کی علمی تربیت، درس و تدریس اور علمی مسائل کی تحقیق و تفتیش تھا اس لیے ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا زیادہ وقت ملا۔ سید العلماء کی اولاد میں جنّت مآب کا ذکر مرکز توجہ ہے۔ موصوف نے بڑی ریاضت کر کے ان سے اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کرائے۔ جنّت مآب کے ہم درسوں میں بڑی نامور شخصیتیں گذری ہیں۔ ان میں جناب مفتی سید محمد عباس صاحب قبلہ کا درجہ بہت بلند ہے

موصوف نے اپنے ”ہم عصر“ ممتاز العلماء سید تقی صاحب کی امتیازی شان کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

”سنّاہوا حذف منا و اقدم منا فضلا“

(اوراق الذہب)

یعنی ”وہ ہم سے اگرچہ عمر میں کم ہیں لیکن علم و فضل کے لحاظ سے ہم پر مقدم ہیں۔“

آپ کے تصانیف حسب ذیل ہیں:

ارشاد المومنین، مرشد المومنین، عباب، شرح مقدمات حدائق، نخبة الدعوات، صدیقة الواعظین، نزہة الواعظین، شرح تبصرہ، غنیة السائلین، ینابیع الانوار، رسالہ (در فقہ استدلالی)، رسالہ (در نجاست طعام اہل کتاب)، رسالہ (در امامت)، رسالہ (در آداب و فضائل دعا)

(۵) فردوس مکان مولانا سید ابراہیم (سید العلماء)

آپ کی ولادت ۱۲۶۵ھ میں ہوئی۔ وہ عظیم شخصیتیں جنہوں نے ہمارے خیال و کردار اور ہمارے قومی و ملی جذبے کو ایک سے زیادہ پہلوؤں سے متاثر کیا، ان میں فرزند جنّت مآب فردوس مکان مولانا سید محمد ابراہیم صاحب قبلہ کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ وہ عظیم خوبیوں کے مالک اور ایک قوم پرور مفکر تھے۔ انہوں نے اپنی ہمہ گیر مقبولیت سے تاریخ اودھ کا دھارا موڑا۔ یہ آپ ہی کا کارنامہ تھا کہ ایک مذہب پرست قوم میں مغربی تعلیم کی مشروط منظوری کے ساتھ شیعوں میں روشن خیال مکتب فکر کی بنیاد ڈالی۔ جدید علوم و فنون میں ہماری کامیابیاں ان ہی کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

ممدوح نے معقولات کی تکمیل مولانا کمال الدین

(۶) مولانا سید ابوالحسن (ممتاز العلماء)

۱۲۹۸ھ میں ولادت اور ۱۳۵۵ھ میں وفات ہوئی۔ منطق، فلسفہ معانی و بیان اور مقدمات فقہ و اصول فقہ کی کتابیں بحر العلوم جناب علّٰی صاحب قبلہ اور ان کے علاوہ خاندان اجتہاد کے دوسرے ممتاز علماء سے پڑھیں۔ ۱۳۲۷ھ میں تکمیل علم کی غرض سے اپنے متعلقین کے ہمراہ عراق تشریف لے گئے۔ وہاں آیۃ اللہ شیخ فخر اللہ (شیخ شریعت) آیۃ اللہ آخوند ملا محمد کاظم خراسانی، آیۃ اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے، انہیں بزرگوں نے اجازات اجتہاد دیئے۔ ۱۳۳۲ھ میں عراق سے واپس آئے۔

صاحب تذکرہ بے بہا، خود جید الاستعداد عالم تھے۔ انہوں نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے: ”اجتہاد تو آپ کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔“

موصوف کے امثال و نظائر بس عراق و ایران کے علماء میں تھے۔ آپ کی ساری عمر تدریس و تربیت طلباء میں گزری۔ آپ کے زمانے کے علماء دین کا تصنیف و تالیف کے علاوہ یہی ایک مستقل مشغلہ تھا۔ اس لیے ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں مدرسۃ الواعظین (لکھنؤ) کے مدرس اول تھے۔ مشہور و معروف واعظین و مبلغین نے مدوح سے فیض حاصل کیا تھا۔

تصنیفات:

حاشیہ بر کفایۃ الاصول، البرق الومیض فی منجزات المریض، تجزی فی الاجتہاد۔

آپ اپنے دور کے اکثر علماء و مجتہدین سے علم تھے، آپ کے دور میں جو فضلاء فارغ التحصیل ہوئے تقریباً وہ سب کے سب آپ کے شاگرد تھے۔

صاحب سے کی۔ فقہ و اصول کی کتابیں اپنے والد ماجد جنت مآب مولانا سید تقی صاحب سے پڑھیں۔

۱۸۵۷ء کی اولین جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے شہر لکھنؤ کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور مسجد آصفی اور بڑے امامباڑہ کو فوج کی چھاؤنی بنا دیا گیا۔ اسی طرح شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کی مسجد بھی ”جرم بغاوت“ میں ضبط کر لی گئی۔ موصوف نے زبردست احتجاج کیا اور شیعوں کی مسجد شیعوں کو اور اہل سنت کی مسجد سنیوں کو واپس دلوائی۔ مسجدیں واگذار ہوئیں اور آج تک وہ اپنے اپنے فرقہ کے قبضے میں ہیں۔

کسے خبر تھی کہ یہ عبقری شخصیت اور باغ و بہار ذات صرف ۴۲ بہاریں دیکھنے کے بعد ہی خزاں سے دوچار ہونے والی ہے۔ ملی خدمات نے ایک لمحہ کے لیے بھی آرام و سکون سے رہنے نہیں دیا۔ مختلف امراض کے حملے نے شدید ضعف پیدا کر دیا۔ ۲۲ جمادی الاول ۱۳۰۷ھ عصر کے وقت کلمہ طیبہ پڑھ کر اشارے سے پس ماندگان کو رخصت کیا اور خوشی سے موت کا استقبال کیا۔ خلقت کے ہجوم میں تابوت عقب مسجد تحسین، صحن حسینیہ جنت مآب میں لایا گیا۔ اولاد کے نابالغ ہونے کی وجہ سے حسب وصیت باقر العلوم مولانا سید باقر صاحب کے والد جناب مولانا ابوالحسن عرف مولانا ابوصاحب قبلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اشکبار قوم کے جھرمٹ، نالہ و شیون اور آہ و بکا کے درمیان اپنے والد علام ممتاز العلماء کے پائین پاسپرد خاک کیے گئے۔

تصانیف

تفسیر سورہ یوسف، یواقیت الدرر، نور الابصار، الشمعۃ فی الجمعۃ، ینایع انوار (جلد ۳)

ولادت

آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی طاب ثراہ ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں متولد ہوئے۔ اس وقت خاندان اجتہاد کے اکابر علماء میں جناب عماد العلماء سید مصطفیٰ عرف میر آغا صاحب طاب ثراہ اور جناب بحر العلوم مولانا سید محمد حسین عرف علّٰن صاحب طاب ثراہ دو ہستیاں سب سے بزرگ تھیں۔ جناب عماد العلماء چونکہ جناب جنت مآب سید تقی صاحب قبلہ کے داماد تھے، اس طرح ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب طاب ثراہ کے پھوپھا تھے، اس لیے اس گھر سے انتہائی عزیزانہ محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ مولود کی رسم عقیقہ آپ ہی نے انجام دی۔ اس وقت ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ ہندوستان کی درسیات کی تکمیل میں مصروف تھے، جلد ہی تمام منزلیں طے کر کے ۱۳۲۷ھ میں معہ متعلقین تکمیل علم کے لیے راہی عراق ہوئے۔ سید العلماء آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر تین اور چار سال کے درمیان تھی۔

یہ دور نجف کا زریں دور تھا۔ اکابر علماء میں آخوند ملا کاظم خراسانی مصنف 'کفایۃ' اور سید کاظم طباطبائی اور آقائے شریعت فتح اللہ اصفہانی کا، پوری دنیائے اسلام میں شہرہ تھا۔ ان کے حوزہ درس میں ہزار ہا افراد شریک ہوتے تھے۔ صرف آخوند خراسانی کے حوزہ درس میں بارہ سو طلباء جو سب کے سب تقریباً درجہ اجتہاد پر فائز تھے، زیر منبر ہوتے تھے۔ ایسا زریں دور خود نجف اشرف میں اس سے پہلے اور بعد، تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت علماء اور افاضل کی باہمی ملاقات میں صرف مباحث علمی موضوع گفتگو ہوتے تھے۔ اس ماحول میں سید العلماء کے شعور کا ابتدائی ارتقاء ہوا، اس طرح عربی اور فارسی مثل مادری زبان کے ہو گئیں۔

طبیعت کے میلان اور ماحول کے تقاضے کا نتیجہ یہ تھا کہ بچپن میں آپ کھیل کود سے بالکل الگ رہے بلکہ آپ کی تفریح یہ تھی کہ اپنے والد ماجد کے پاس بیٹھ کر علمی مباحث کو سنتے تھے۔ ساتویں سال روضہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام پر مقدس اور متورع عالم آقائے سید محمد علی شاہ عبدالمعظمی نے رسم بسم اللہ انجام دی۔ اس کے بعد تعلیم کا آغاز ہو گیا، اور جیسا کہ آپ کے والد گرامی نے اپنے اجازہ میں تحریر فرمایا ہے، تعلیم کا ارتقاء اس غیر معمولی تیزی کے ساتھ ہوا کہ چھ مہینے کے اندر قاعدہ اور تقریباً پورا قرآن مجید ختم ہو گیا۔

آپ کی عمر ۹ برس کی تھی جب ۱۳۳۲ھ (آخر ۱۹۱۳ء یا آغاز ۱۹۱۴ء) میں آپ کے والد گرامی درجہ اجتہاد پر فائز ہو کر ہندوستان واپس آئے، اس وقت صرف ادوئح کی کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔ لکھنؤ میں بھی آپ کا ویسا ہی علمی ماحول رہا۔ آپ کے برادر معظم مولانا سید محمد عرف میرن صاحب قبلہ سلطان المدارس میں پڑھ رہے تھے۔ ہم درس افراد آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ یہ سلطان المدارس کے ممتاز طالب علموں کا دور تھا جن میں جناب عماد العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب طاب ثراہ اور مولانا سید عبدالحسین صاحب وغیرہ خاص امتیاز کے مالک تھے۔ یہ حضرات وقتاً فوقتاً مولانا میرن صاحب طاب ثراہ کے پاس جمع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطان المدارس اور جامعہ ناظمیہ دونوں جگہ کے ممتاز اور منتہی طالب علم جناب ممتاز العلماء ابوالحسن صاحب سے پڑھنے گھر پر آیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی سید العلماء کا محبوب مشغلہ ان لوگوں کی گفتگو نیز درس و تدریس سننا تھا۔ (یہ حقیقی علماء کا دور تھا۔ ان کا ذہب علماء کا دور نہیں تھا جب گفتگو کا محور استدالات کے بجائے غیبت، افتراء سخرگی اور سیاست بازی بن گیا۔)

ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں تمام کتابیں سرکار ممتاز العلماء نے خود ہی پڑھائیں، لیکن والد کی علالت کے زمانے میں تدریس کا کام آپ کے بڑے بھائی میرن صاحب طاب ثراہ انجام دیتے تھے۔ اس طرح آپ کے اساتذہ کی فہرست طولانی نہیں ہو سکی۔ باوجودیکہ عراق سے آنے کے بعد ایک مدت تک ممتاز العلماء طاب ثراہ بڑے مصائب اور معاشی مشکلات میں مبتلا رہے جن میں سید العلماء اس کم سنی میں شریک و سہم تھے مگر پھر بھی دنیا کی کوئی مشکل اور رکاوٹ جناب ممتاز العلماء کو اپنے اس فرزند کی تعلیم سے غافل نہ کر سکی۔ اپنے فرزند کی تعلیم کے سلسلے میں ممتاز العلماء نے ایک مشکل روش اختیار کی تھی۔ یعنی نہ فقط سید العلماء سے عربی کی مشکل کتابوں کی عبارتیں پڑھواتے تھے۔ بلکہ اس کا ترجمہ اور تشریح بھی خود آپ ہی سے کرواتے تھے۔ صرف جہاں تصحیح یا تکمیل کی ضرورت ہو وہاں لب کشا ہوتے تھے۔

اس ابتدائی دورِ تعلیم کا ایک واقعہ دل چسپ ہے۔ جب شیعہ علماء تخصیص اور تعلیم کی بحث کی وجہ سے آل انڈیا شیعہ پولینکل کانفرس سے بدل ہوئے تو جناب قدوة العلماء آقا حسن صاحب طاب ثراہ نے شیعہ بیت المال قائم کیا جس کا مرکز امام باڑہ جھاؤلال تھا۔ اس میں آپ نے ایک مدرسہ قائم کیا جس کا افتتاح بہت شان دار طریقے سے ہوا جس میں اس وقت کے تمام اکابر ملی اور کثیر التعداد رؤسا شریک ہوئے۔ طالب علم کے طور پر قدوة العلماء نے مولانا علی نقی طاب ثراہ کو منتخب کیا۔ اس وقت آپ منطق کی کتاب ”سلم العلوم“ پڑھتے تھے۔ یہ طے پایا کہ رسمی طور پر بطور افتتاح اس کتاب کی چند سطریں جناب ناصر الملت آپ کو پڑھادیں۔ ناصر الملت نے کتاب سلم کا وہ مقام جو ابھی آپ کو پڑھایا نہیں گیا تھا،

کھول کر کہا:

عبارت پڑھئے:

وہ چند سطریں پڑھوانا چاہتے تھے مگر سید العلماء نے فر فر پورا ایک صفحہ پڑھ دیا جس میں کہیں اعراب و زیروں کی غلطی نہیں تھی۔ اس کے بعد آپ نے حسب عادت خود ہی اس کا ترجمہ اور شرح شروع کر دی۔ جب کچھ پڑھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا تو جناب ناصر الملت نے اس مطلب پر اعتراض کیا اور تقریباً دس منٹ تک علمی بحث اور استدلالی رد و بدل ہوتا رہا۔ اس پر جناب نجم الملت جو ان کے برابر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ہی استاد کے شاگرد ہونے کے لحاظ سے جناب ناصر الملت سے بے تکلف تھے، بول اٹھے:

”یہ رسمی طور پر تعلیم کا افتتاح ہو رہا ہے، زبانی امتحان کا کوئی موقع نہیں۔“

خود سید العلماء کو اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہیں ہوئی تھی مگر شہر میں عام طور پر شہرہ ہو گیا کہ ایک بچے نے ناصر الملت سے بحث کی۔

اسی دور میں سرکار ممتاز العلماء نے فیصلہ کیا کہ ان کے فرزند کو عربی ادب میں بھی کمال حاصل ہونا چاہئے۔ جناب غفرانمآب سے لے کر اب تک علمائے خاندان اجتہاد ادب کی بحیثیت فن کسی اہمیت کے قائل نہ تھے اور اس کو بہت ضمنی حیثیت دیتے تھے۔ بس کتب درسیہ اور پھر مطالعہ قرآن و حدیث سے جو ملکہ عربی عبارت لکھنے کا پیدا ہوتا تھا اسی کو کافی سمجھتے تھے۔ دوسرے بعض سلسلوں کے افراد علماء چونکہ فقہ و اصول اور دیگر علوم عقلیہ اور نقلیہ میں یہ پایہ نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کی طرف سے بڑی شدت سے یہ پروپیگنڈہ ہوتا تھا کہ اصل جو چیز ہے وہ ادب ہے اور جب تک ادیب نہ ہو

دوسرے سال دونوں جگہ کے ضمیموں کا اور تیسرے سال ممتاز الافاضل اور صدر الافاضل کا ایک ہی ساتھ امتحان دیا، اور اس ذیل میں جناب نجم الملت مولانا سید نجم الحسن صاحب طاب ثراہ پرنسپل ناظمیہ اور باقر العلوم مولانا سید محمد باقر صاحب طاب ثراہ پرنسپل جامعہ سلطانیہ سے تلمذ حاصل ہوا۔

سرکار سید العلماء کو بلا استثناء اپنے ہر درجے میں اولیت حاصل رہی۔ حالانکہ سرکار، سلطان المدارس اور ناظمیہ دونوں کے طالب علم اور فارغ التحصیل تھے، لیکن سرکار نجم الملت آپ کے ساتھ خصوصی شفقت فرماتے تھے اور اس لیے دوران طالب علمی میں سرکار کی ہمدردیاں مدرسہ ناظمیہ کے ساتھ ہی تھیں، یا جب بھی مدرسہ ناظمیہ پر ناروا حملہ ہوا، جس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، یا مدرسہ کی آبرو کا سوال ہوا تو سرکار نجم الملت نے اپنے اس ممتاز شاگرد سے مدد حاصل کی۔ اس ذیل میں دو واقعات پیش کئے جاتے ہیں:

سید العلماء کے دوران تعلیم میں ایک مذہبی جنتری میں جو کھجور ضلع سارن (بہار) سے شائع ہوتی تھی، ایک مضمون سلطان المدارس کے متعلق نکلا جس میں غلط بیانیوں سے کام لے کر جتنے اکابر علماء تھے ان کو کھینچ تان کر سلطان المدارس کا طالب علم ثابت کیا گیا تھا۔ یہ مضمون بہت سے اہل علم کے طبائع پر بار ہوا۔ اس کے جواب میں ’اودھ پنچ‘ میں، جو اپنے رنگ کا ایک منفرد مزاحیہ اخبار تھا، ’’جنتری البلاد‘‘ کی سرخی سے ایک مضمون چھپا جس میں اس مضمون کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ حقائق پر مبنی علمی رد نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔ سرکار نجم الملت اور مدرسہ کے اکابر چاہتے تھے کہ حقائق پر مبنی علمی جواب دیا جائے۔ اس وقت جب مدرسہ کے دفاع کے لیے کوئی قلم میدان میں نہیں آیا تو سرکار سید العلماء کا ایک مسلسل مضمون

اس وقت تک عالم ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ اکابر خاندان اجتہاد کی وہ عبارتیں دیکھی جائیں تو ان میں ادب کی کمی نہیں ہے۔ مگر یہ حضرات باقاعدہ نصاب درس کے طور پر عربی شعر و ادب کی کتابیں نہیں پڑھتے تھے۔ جناب ممتاز العلماء غالباً چاہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے کی تعلیم میں اس کمی کو دور فرمائیں۔ عربی ادب کی تعلیم جناب مفتی محمد علی صاحب قبلہ (بڑے مفتی صاحب) کے ذمہ ہوئی۔ اس دور میں آپ نے الہ آباد بورڈ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے عالم، فاضل ادب اور دوسرے امتحانات میں شرکت کی اور ہر درجہ میں سب سے ممتاز طالب علم رہے۔

سید العلماء نے ادب میں وہ کمال حاصل کیا کہ قاہرہ اور دمشق کے ممتاز عربی رسالوں میں آپ کے اشعار اور مضامین شائع ہوئے اور علامہ امینی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الغدیر میں آپ کا عربی قصیدہ درج کیا۔ آپ کی ادبیت اس حد تک مسلم ہو گئی کہ وہی حضرات جو صرف ادب میں تبحر کو معیار علم مانتے تھے وہی اب ادب کی اہمیت کو گھٹانے لگے۔

مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس میں دور تعلیم

مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس ہندوستان کے سب سے ممتاز مدارس دینی ہیں۔ ان دونوں مدرسوں میں باہمی رقابت رہی ہے۔ کچھ علماء جو سلطان المدارس کے فارغ التحصیل تھے وہ اس مدرسہ کی اہمیت میں مبالغہ کرتے رہے ہیں اور جو جامعہ ناظمیہ کے فارغ التحصیل ہیں وہ ناظمیہ کو زیادہ ممتاز سمجھتے ہیں۔ سرکار سید العلماء ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جو ناظمیہ اور سلطان المدارس دونوں جگہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ نے مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس دونوں جگہ کے فاضل اور سند الافاضل کا ایک ہی سال میں امتحان دیا۔ پھر

”متعلم سلطان المدارس کی غلط بیانیوں“ کے عنوان سے روزنامہ ”حقیقت“ لکھنؤ میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ سید العلماء کے دوران تعلیم ہی میں ممبئی کے مقتدر رئیس ناظم التجار محمد ہاشم اصفہانی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے لکھنؤ آئے۔ ناظم التجار نہ فقط یہ کہ خیر افراد میں سے تھے بلکہ عربی ادب میں دسترس بھی رکھتے تھے۔ وہ سلطان المدارس اور جامعہ ناظمیہ دونوں مدرسوں میں آنے والے تھے۔ پہلے ناظم التجار سلطان المدارس گئے، وہاں طلباء نے اردو اور عربی دونوں میں خیر مقدمی قصیدے پڑھے۔ اس زمانے میں دونوں مدرسوں میں بہت سخت رقابت تھی اور ہر ایک جوہر کمال کے اظہار میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ نجم الملت فکر مند تھے کہ ایک دن رہ گیا ہے اور عربی قصائد کے سلسلے میں ناظمیہ پیچھے رہ جائے گا۔ اس امر کا اظہار نجم الملت نے حکیم محمد عباس صاحب (اہل سری ضلع مراد آباد) سے کیا۔ چونکہ شفاء الملک حکیم میرن صاحب قبلہ مالک معدون الادویہ لکھنؤ ناظمیہ کے سکریٹری تھے اور حکیم محمد عباس صاحب اس دور میں معدن الادویہ کے منیجر تھے، اس لیے نجم الملت طاب ثراہ سے خاص روابط رکھتے تھے۔ حکیم صاحب نے آکر اس امر کا تذکرہ سید العلماء سے کیا۔ سرکار نے فرمایا کہ آپ قلم اور کاغذ لے لیں، میں مصرع بولتا جاتا ہوں آپ لکھتے جائیں۔ سرکار نے یکے بعد دیگرے چار قصیدے مختلف ردیف وقافیہ اور زمینوں میں فی البدیہہ لکھوا دیئے۔ حکیم صاحب جو اس شعری صلاحیت سے مبہوت رہ گئے تھے، سرکار نجم الملت کے پاس آئے اور ان سے عرض کیا کہ ناظمیہ اس سلسلے میں بھی سلطان المدارس سے پیچھے نہیں رہے گا، وہاں تین خیر مقدمی قصیدے پڑھے گئے تو یہاں چار پڑھے

جائیں گے۔ نجم الملت انتہائی مسرور ہوئے اور یہ طے پایا کہ عربی ادب میں ناظمیہ کی برتری کے اظہار کے لیے ناظم التجار سے کہا جائے کہ آپ فی المجلس کوئی عربی شعر پڑھئے اور مدرسہ کا ایک طالب علم فوراً اسی زمین، ردیف اور قافیہ میں چند عربی شعر نظم کر کے سنائیں گا۔ سید العلماء کے چاروں قصیدوں کو چار مختلف طالب علموں نے پڑھا جس کو سب نے بہت پسند کیا۔ ناظم التجار نے اپنی تقریر میں جناب سیدہ کا مشہور شعر پڑھا۔

ضَبْتُ عَلَيَّ مَصَائِبَ لَوْ أَنَّهَا

ضَبْتُ عَلَيَّ الْآيَامَ صِرْنَا لَيًّا لَيًّا

سید العلماء نے فوراً اسی ردیف وقافیہ میں سات خیر مقدمی شعر نظم کر دیئے اور جب، جا کر سنائے تو چاروں طرف سے علماء نے جن میں سرکار نجم الملت اور مولانا سبط حسن صاحب مرحوم شامل تھے، صدائے احسن بلند کی اور ناظم التجار کے دل پر ناظمیہ مدرسہ کی علمی عظمت کا سکہ جم گیا۔ حکیم محمد عباس صاحب فرماتے تھے کہ جب آپ اشعار پڑھ کر اسٹیج سے گئے۔ تو مولانا سبط حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ نے فرمایا: ”خدا نظر بد سے بچائے۔ ایسے بچے زندہ کم رہتے ہیں۔“ سرکار سید العلماء کے جو مدرسہ ناظمیہ پر احسانات اور اس کا نام روشن کرنے کے سلسلے میں جو خدمات ہیں اس کی فہرست طویل ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لیے اور اس کے اظہار کے لئے۔ سرکار نجم الملت جیسا واقعی عالم بھی ہونا چاہئے، جس میں حق بینی کی صلاحیت ہو اور حق گوئی کی طاقت۔ جن کا اصل ملکہ احسان فراموشی، ناپاس گزاری، بے علمی اور بے عملی نہ ہو۔

تصنیف و تالیف کا آغاز

اس زمانہ طالب علمی میں ”سرفراز“، لکھنؤ اور ”شیعہ“ لاہور اور مدرسۃ الواعظین کے رسالہ الواعظ میں مضامین کے

سلسلے کے علاوہ تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ حسب ذیل کتابیں اس دور میں آپ کے قلم سے نکلیں اور لکھنؤ میں شائع ہوئیں:-

(۱) روح الادب شرح لامیۃ العرب

(۲) البیت المعمور فی عمارة القبور

(۳) فریاد مسلمانان عالم

(۴) التوائے حج پر شرعی نقطہ نظر سے بحث

اسی زمانے میں تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ جو کتاب پڑھتے تھے اس پر اتنا تبحر حاصل ہو جاتا تھا کہ بلافاصلہ اس کو تدریس فرما سکتے تھے۔ گھر پر تو سبق ہوا ہی کرتا تھا۔ کچھ زمانے تک بحیثیت مدرس درجہ معقولات ناظمیہ میں بھی تدریس فرمائی۔ اس دور کے متعدد شاگرد قوم و ملت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) مولانا محمد بشیر صاحب فاتح ٹکسلا، پنجاب

(۲) مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری، سابق صدر شعبہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

(۳) جناب حیات اللہ انصاری صاحب، سابق مدیر روزنامہ 'قومی آواز'، لکھنؤ۔

(۴) مولانا شمس حسن صاحب صدر الافاضل حیدر آباد، سندھ

(۵) حکیم سید خورشید حسن صاحب انچارج شفا خانہ شاہی، لکھنؤ

(۶) حکیم سید محمد اطہر صاحب ممتاز الافاضل۔

سفر عراق

سید العلماء ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں تکمیل علم کے لیے عراق تشریف لے گئے۔ عراق کا پانچ سالہ دوران قیام آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی علیہ الرحمہ کی زندگی کا ایک زریں باب ہے۔ ان پانچ برسوں میں سرکار نے نہ صرف فقہ و حدیث

میں وہ ملکہ پیدا کیا کہ اس دور کے شیعہ تاریخ کے تین عظیم ترین مجتہد یعنی آیۃ اللہ العظمیٰ ابوالحسن اصفہانی، آیۃ اللہ العظمیٰ نائینی اور آیۃ اللہ العظمیٰ سید ضیاء عراقی نے آپ کو ایک ایسا مجتہد تسلیم کیا جس کی تقلید کی جاسکتی ہے، بلکہ علم حدیث میں اس دور کے عظیم ترین محدثین یعنی شیخ عباس قمی اور سید حسن صدر سے خراج تحسین لیا اور علم کلام میں اس دور کے عظیم مفکرین مثلاً سید شرف الدین، شیخ محمد حسین کاشف الغطاء، شیخ جواد بلاغی اور سید محسن امین عاظمی نے آپ کا لوہا مان لیا۔ عربوں کے درمیان عربی ادب کے ایسے شاہکار پیش کیے کہ آپ کے اشعار کو علامہ امینی نے 'الغدير' میں نقل کیا۔

سرکار شعبان کے آخری دنوں میں عراق پہنچے۔ رمضان کر بلائے معلیٰ میں گزارا، کیونکہ رمضان کے مہینے میں نجف کے حوزہ علمیہ میں تعطیل ہوتی ہے اور شوال میں درس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے یکم شوال کو نجف اشرف پہنچے (گویا سرکار کے لیے مشیت الہی نے یکم شوال کا دن اپنے جد علی ابن ابی طالب کے پاس پہنچنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔)

عراق اور ایران کے حوزہ میں دو طرح کے درس ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلے کے درس کو 'سطحیات' کہا جاتا ہے۔ اس مرحلے پر فقہ اور اصول فقہ کی اعلیٰ ترین کتابیں، جن میں شیخ مرتضیٰ انصاری کی 'رسائل' اور 'مکاسب' اور آخوند خراسانی کی کفایہ، شامل ہیں، پڑھائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے مدرسوں میں تو کتابوں کی تدریس کے سلسلے میں طریقہ یہ ہے کہ طالب علم عبارت پڑھتا ہے، ترجمہ کرتا ہے اور استاد مطلب بیان کرتے ہیں اور جو مسائل ضروری ہوں وہ بتاتے ہیں۔ عراق اور ایران میں عبارت بھی استاد ہی پڑھتے ہیں اور مطلب بھی خود ہی بیان کرتے ہیں۔ جو قابل طالب علم ہیں وہ اعتراض

کرتے ہیں یا اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو سوال کرتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ درس ”خارج“ کہلاتا ہے۔ اس مرحلے میں استاد کسی کتاب کا پابند نہیں ہوتا بلکہ فقہ اور اصول فقہ کے مباحث کے بارے میں تمام مختلف قدیم و جدید علماء کے نقطہ نظر کو لے کر اس کا تجزیہ و تحلیل و تنقید کرتا ہے اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ اگر طالب علموں کی تعداد کم ہو تو استاد فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور شاگرد اس کے گرد حلقے کی صورت میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اگر طالب علموں کی تعداد زیادہ ہو تو استاد کرسی یا منبر پر درس دیتا ہے شاگرد خود ان موضوعات پر مطالعہ کر کے آتے ہیں، اور اگر کسی بات سے اختلاف رکھتے ہوں تو بحث کرتے ہیں، اسے اجتہاد کی ٹریننگ سمجھنا چاہیے۔

سطحیات میں جو کتابیں نجف اور قم میں رائج ہیں، ان کے چند باب ہندوستان کے مدرسوں کے آخری درجوں میں پڑھائے جاتے ہیں لیکن نجف و قم میں پوری کتاب پڑھنا ہوتی ہے۔ یہ کتابیں تین برس سے کم میں ختم نہیں ہو سکتیں۔ پھر درس خارج کے لیے چند سال اور چاہئے، اس طرح جو لوگ مختصر مدت نجف یا قم میں رہ کر واپس آ جاتے ہیں وہ حقیقت میں تعلیم حاصل نہیں کرتے بلکہ صرف عمامہ پہن کر واپس آ جاتے ہیں۔

سرکار سید العلماء نے سطحیات میں رسائل کو خود مصنف کتاب شیخ مرتضیٰ انصاری کے نواسے آقا سید احمد سبط سے اور ”مکاسب“ نجف کے اس دور کے ممتاز مدرس اور عالم آیتہ اللہ نوری سے اور کفایۃ الاصول آیتہ اللہ مشکینی سے پڑھیں۔

آیتہ اللہ العظمیٰ سید علی نقی علی اللہ مقامہ نے درس خارج اس صدی کے تین سب سے بڑے مجتہدین یعنی سید ابوالحسن اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ، مرزا حسین نائینی اور سید ضیاء عراقی سے

حاصل کیے۔ اس وقت نجف اشرف میں یہ تین درس اول نمبر کے تھے ان میں سے ہر درس میں کئی سوطلباء شریک ہوتے تھے۔ سرکار سید العلماء ان معدودے چند افراد میں تھے جو ممتاز طالب علم سمجھے جاتے تھے اور درس خارج میں مختلف موضوعات پر علمی استدلال کرتے تھے۔ سب سے زیادہ خصوصیت اور قربت آپ کو آیتہ اللہ نائینی سے حاصل تھی۔

ہمارے دور کے دوسرے مراجع مثلاً آیتہ اللہ العظمیٰ خوئی اور آیتہ اللہ العظمیٰ مرعشی نجفی اور آیتہ اللہ العظمیٰ سہروردی، خونساری اور گلپایگانی بھی انھیں عظیم مجتہدین میں سے کسی ایک کے شاگرد ہیں۔ آیتہ اللہ العظمیٰ خوئی اس وقت سینئر طالب علم تھے اور اپنے استاد مرزا نائینی کے درس میں بعض نکات کو دوسرے شاگردوں کے لیے تشریح کرتے تھے۔ کیونکہ سرکار ابوالحسن اصفہانی اور سرکار ضیاء عراقی کے برخلاف جو فارسی میں درس کہتے تھے، سرکار نائینی کا درس عربی میں ہوتا تھا لیکن دوسرے اکثر مراجع جن کی اس وقت دنیائے اسلام میں تقلید ہوتی ہے اس وقت نجف میں آیتہ اللہ العظمیٰ سید علی نقی مرحوم کے مقابلے میں کہیں کم امتیاز اور شہرت کے مالک تھے۔

یہ ہندوستان کے جاہل معاشرہ کی ستم ظریفی تھی کہ وہ جس کا نام آیتہ اللہ خوئی اور آیتہ اللہ نجفی مرعشی اور گلپایگانی کے ساتھ آتا ہے اس کا نام ہر زید و بکر کے ساتھ لیا جانے لگا۔ اس امر میں بھی سید العلماء نے اپنے آقا اور جد علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی تاسی کی۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا کہ زمانے نے مجھے اتنا گھٹایا کہ میرا نام معاویہ کے ساتھ آنے لگا۔ انھیں حالات سے امیر المومنینؑ کے پیرو عظیم علماء کو بھی دو چار ہونا پڑا۔

نجف میں عربی تصنیف و تالیف

نجف پہنچ کر سب سے پہلے جو کتاب آپ نے تصنیف

کی وہ وہابیت کے خلاف تھی جو بعد میں کشف النقاب عن عقائد عبدالوہاب نجدی کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دنیائے اسلام میں وہابیت کی پہلی استدلالی رد ہے۔ اس کے بعد اسی بنیاد پر اس دور کے مشہور لبنانی عالم حسن امین عالمی نے کتاب کشف الارتباب تحریر فرمائی۔ عراق و ایران کے مشہور اہل علم اور صاحبان قلم نے اس کتاب کو ایک شاہکار کتاب قرار دیا۔ ان علماء میں جنہوں نے فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہندوستانی اہل قلم کی تالیف کی کھل کر تعریف کی ان میں آقائی شیخ محمد علی قمی اور آیت اللہ العظمیٰ عبدالکریم یزدی شامل ہیں۔ یاد رہے کہ عبدالکریم یزدی قم کے حوزہ علمیہ کے موسس اور ان افراد میں تھے۔ جنہیں بعض علم مانتے تھے۔ تمام علمی حلقوں نے اس کتاب کو اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے بہتر قرار دیا۔ آیت اللہ العظمیٰ خوی نے کتاب کے اوپر ایک تقریظ لکھی اور کتاب کی بے حد تعریف کی۔ کیونکہ وہابی عقائد نہ فقط شیعوں کے لیے بلکہ اہلسنت میں بھی اصحاب تصوف کے لیے بڑا خطرہ تھے اس لیے ہندوستان میں جب یہ کتاب پہنچی تو بزرگ مرتبہ سنی عالم اور شیخ طریقت شاہ سلیمان پھلواڑی نے اس پر نظم و نثر میں تقریظ لکھ کر روانہ کی۔

اسی دور میں لبنان کے مشہور عالم سید محسن امین عالمی کا رسالہ قمہ زنی کی مخالفت میں شائع ہوا۔ ان کا نقطہ نظر تھا کہ امام حسین علیہ السلام کا نام لے کر اپنے کو تکلیف پہنچانا قطعی درست نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ انتہا پر پہنچ گئے اور ہر طرح کے ماتم کی مخالفت کر دی۔ نجف کے علمی حلقوں میں اس رسالے کی اشاعت پر بے چینی پیدا ہو گئی۔ سرکار مرزا حسین نائینی وغیرہ نے کھل کر اس کی مخالفت کی جبکہ سرکار

ابوالحسن اصفہانی نے قمہ زنی کے معاملے میں توقف (نہ مدافعت نہ مخالفت) کا موقف اختیار کیا۔ لیکن مخالفت زیادہ تر فتوؤں اور تقریروں پر محدود تھی۔ کوئی استدلالی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ اس کمی کو سرکار سید العلماء نے پورا کیا۔ آپ کی ایک انتہائی استدلالی کتاب عربی میں ”اقالة العاثر في اقامة الشعائر“ شائع ہوئی۔ اس میں خالص علمی انداز میں ماتم وغیرہ کا جواز ثابت کیا گیا اور ان اکابر علماء کی فہرست درج کی گئی جو اس کے حق میں ہیں۔ یہ کتاب بھی نجف اور پوری شیعہ دنیا میں بہت مقبول ہوئی۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ جو پوری شیعہ دنیا میں پہلی دفعہ وہابیت کی رد اور مراسم عزائے حسینؑ کے دفاع میں قلم لے کر میدان میں آیا تھا اس پر ان لوگوں نے، جن کی خدمات اس سلسلے میں ذرہ برابر بھی نہ تھیں وہابیت اور عزائے حسینؑ کی دشمنی کے الزامات لگائے۔ لیکن تاریخ کے ہر دور میں منافق عناصر حق کے علمبرداروں سے اسی طرح پیش آتے رہے ہیں۔ ابوسفیان فتح مکہ تک اسلام کے دشمنوں کا سرخیل رہا اور امیر المومنین حضرت علیؑ کی شمشیر نے اسلام کو اس کے حملوں سے بچایا، لیکن چند سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ابوسفیان کے ورثہ دار، شام کے صاحب اقتدار، اسلام کے محافظ حضرت علی علیہ السلام پر یہ الزام لگا رہے تھے کہ (معاذ اللہ) وہ دین اسلام کے دائرے سے نکل گئے ہیں، اور ان کے پیرو افراد پر ابن سبا یہودی کے پیرو ہونے کا الزام لگنے لگا۔ امیر المومنینؑ کے سچے پیرو علماء کے ساتھ بھی ابوسفیانی عناصر نے ہر دور میں یہی رویہ اپنایا اور یہی ہتھکنڈے استعمال کیے۔ اس لیے تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس دور کے ابوسفیانیوں نے شام کے عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھایا اور ان کو اسی جہالت میں

ارسال کیے اور سرکار سید العلماء نے چار سو صفحات میں اس فرقہ کی رد میں ایک کتاب ”السيف الماضی علی عقائد الاباضی“ کے عنوان سے لکھی جواب بھی خوارج کی رد میں شیعہ دنیا کی طرف سے دیا جانے والا تھا جواب ہے ان کتابوں کے علاوہ سرکار سید العلماء نے نجف کے دوران قیام میں عربی زبان میں کئی دوسری کتابیں تصنیف کیں جن میں بعض مندرجہ ذیل ہیں:

منجوع التبشیر، نقد الفرائد، مشنف النذیر فی مسئلة التصویر

نجف میں سید العلماء کا دائرہ اثر

جیسا کہ ذکر کیا گیا اس دور میں تاریخ شیعیت کے تین عظیم مجتہد نجف میں موجود تھے:- سرکار ابوالحسن اصفہانی، سرکار نائینی اور سرکار ضیاء عراقی۔ تینوں سرکار سید العلماء سے بے حد شفقت فرماتے تھے اور آپ کا احترام کرتے تھے۔ سید العلماء کا شمار سرکار نائینی کے نزدیک ترین شاگردوں میں تھا۔ سرکار ابوالحسن اصفہانی جو اس وقت علم اور مرجع اعلیٰ سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے سلسلے کے اہم امور بغیر سید العلماء کے مشورہ کے انجام نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ جب فیض آباد کے ادارہ خدام المدارس کے سکریٹری نواب محبوب حسین خاں نے جو راجہ یسین علی خاں صاحب نواب دیوگاؤں کے ماموں تھے سرکار اصفہانی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان تشریف لائیں تو ان سے کہا گیا کہ جب تک سید العلماء تائید نہ کریں سرکار اصفہانی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ سید العلماء نے اس امر کی مخالفت کی اور فرمایا کہ علم زمانہ کی عظمت اس میں ہے کہ وہ بحیثیت قطب اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس کے بعد سرکار اصفہانی نے دعوت قبول نہیں فرمائی۔ سرکار سید العلماء

برقرار رکھنے کی کوشش کی کہ جمعہ کی نماز چہار شنبہ کو پڑھ لیں اور اونٹ و اونٹنی کا فرق نہ سمجھ سکیں۔ اس دور کے ابوسفیانوں نے بھی عوام کی نا آگاہی سے فائدہ اٹھایا اور کوشش کی کہ وہ کسی طرح سید العلماء کی شخصیت اور ان کے واقعی دینی خدمات اور شیعہ عقائد کے دفاع اور شیعیت کی تبلیغ کے سلسلے میں ان کی خدمات سے واقف نہ ہونے پائیں۔

وہابیت کی رد کے علاوہ سرکار سید العلماء نے ایک معرکتہ الآرا کتاب خوارج کے فرقہ اباضیہ کی رد میں جو عمان و مسقط میں حکمران ہے، تحریر فرمائی یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ عمان و مسقط میں اب بھی خوارج کی حکومت ہے۔ اس دور میں وہاں کا سلطان قابوس اسی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ فرقہ صرف ’شیخین‘ کو مانتا ہے اور خلیفہ سوم نیز حضرت علی علیہ السلام کو (معاذ اللہ) دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے۔ اس دور میں فرقہ اباضیہ اس کوشش میں تھا کہ اپنے باطل عقائد کو خلیج فارس کے دوسرے ملکوں میں پھیلا دے۔ اس پر شیعوں میں بہت بے چینی پیدا ہوئی اور ان کے نمائندوں نے بغداد و نجف کے صف اول کے شیعہ اہل قلم علماء سے رابطہ قائم کیا تاکہ وہ فرقہ اباضیہ کی رد میں کوئی کتاب تصنیف کریں۔ اسی ذیل میں شیخ محمد حسین کا شف الغطاء اور شیخ جواد بلاغی نے سید العلماء کا نام پیش کیا کہ اس کتاب کی تصنیف کا مشکل کام ان کے ذمے کیا جائے۔

مشکل یہ تھی کہ فرقہ خوارج اپنے عقائد کو پردہ خفا میں رکھتے ہیں اور اپنی کتابوں کو دوسرے مذاہب کے پیرو افراد تک پہنچنے سے شدت روکتے ہیں۔ لیکن مسقط و بحرین کے شیعوں کے نمائندوں نے کسی صورت سے ان کی کتابوں سے ان کے عقائد کے سلسلے میں معلومات حاصل کر کے نجف

کاظم شیرازی اور آقا صاحبزادے شیرازی تھے۔ اہل قلم علماء میں شیخ جواد بلاغی اور شیخ محمد حسن کاشف الغطاء سید العلماء کا بہت احترام فرماتے تھے۔ کاشف الغطاء نے اپنی معرکتہ الآراء تصنیف ”الذریعۃ“ میں کئی جگہ سید العلماء کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے اور شیعہ دنیا کی دوسری معرکہ آراء تصنیف الغدیر میں آپ کا عربی قصیدہ نقل کیا گیا ہے۔

محسن امین عالمی نے کتاب ”اعیان الشیعہ“ میں آپ کا ذکر کیا ہے اور شیخ شرف الدین نے جوازہ روایت آپ کو عطا کیا اس کو لبنان میں ”ثبت الموسوی فی اجازۃ النقی“ کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔ یہ لوگ اس صدی کے مشہور ترین شیعہ علماء اور اہل قلم ہیں۔ اس دور کے کسی دوسرے ہندوستانی مجتہد کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہے کہ ایران و عراق کے اس درجہ کے علماء اس کا سکتہ مانتے ہوں۔

فقہ اور اصول فقہ میں سید العلماء کا مقام اور کارنامے

(ہندوپاک کے یگانہ مجتہد اعظم)

مجتہد، مرجع یا علم زمانہ ہونے کے لیے فقہ اور اصول فقہ میں مہارت اور قابلیت کی کلیدی اہمیت ہوتی ہے ہندوستان میں اس کی اہمیت کا عوام کو احساس نہیں ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو فر فر عربی، فارسی بول لے یا جس کو معصومین کے متعلق روایات اور معجزات کا زیادہ علم ہو، وہ جید عالم ہے۔ لیکن بدعربوں کے ساتھ وقت گزار کر مکالماتی عربی میں مہارت حاصل کر لینا یا تحفۃ العوام اور توضیح المسائل اور سیرت معصومین اور مناظرہ کی چند کتابیں رٹ کر کوئی مجتہد نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے فقہ اور اصول فقہ میں ٹھوس علمیت اور اجتہاد کا ملکہ حاصل ہونا شرط اوّل ہے۔

کا مشورہ کتنا صائب تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے لیکن اب تک ہر علم اور مرجع اس اصول پر کاربند ہے۔ اب تک ہندوستان میں صف اول کا کیا ذکر ہے صف دوم کا بھی کوئی ممتاز عالم نہیں آیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے مفاد کے لحاظ سے کچھ گروہ جو کسی ایران یا عراق کے صاحب عمامہ کو لے آتے ہیں تو اس کو آیۃ اللہ اور حجت الاسلام سب کچھ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ ایران و عراق میں ان کا شمار طالب علموں یا زیادہ سے زیادہ افاضل میں ہوتا ہے۔ سرکار ضیاء عراقی بھی جن کو بعض لوگ از جملہ سرکار مفتی احمد علی صاحب طاب ثراہ، اعلم مانتے تھے یہ بھی سید العلماء سے شفقت فرماتے تھے۔

ایک چوتھے بزرگ جو سرکار سید العلماء کی بہت قدر کرتے تھے سرکار آقا مرزا علی آقا شیرازی تھے۔ یہ مرزائے شیرازی کے صاحبزادے تھے۔ اس طرح سرکار نائینی و اصفہانی کے پیر بھائی تھے اور نتیجتاً سب علماء ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سید العلماء کو ان سے خصوصیت حاصل تھی اور ان کے یہاں ولادت معصومین کے سلسلے میں جو محافل منعقد ہوتی تھیں اس میں سرکار عربی قصائد پڑھتے تھے۔ موصوف کی ایک خاص ادا یہ تھی کہ تواضع اور انکسار کی بنا پر کسی کو اپنا ہاتھ چومنے نہیں دیتے تھے۔ مصافحے کے وقت بہت تیزی سے ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ سید العلماء کو یہ ادا بہت پسند آئی اس لیے عراق سے واپسی کے بعد آپ نے کچھ دن تک یہ طریقہ اختیار کیا مگر لکھنؤ کی معکوس ذہنیت نے اسے تکبر قرار دیا۔

اس کے علاوہ اس دور کے صف اوّل کے دوسرے علماء اور اہل قلم جن سے سرکار سید العلماء کے صمیمانہ روابط تھے آقا شیخ محمد حسین اصفہانی مصنف حاشیہ کفایہ، آقا شیخ محمد

ساز کو ہر دور میں یہ اعجاز حاصل رہا ہے کہ خرد کا نام جنوں رکھ لیں اور جنوں کا خرد، لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعی مجتہد چند نفر ہی ہوتے ہیں اور مجتہد اعظم تو پوری دنیا میں تین چار سے زیادہ افراد نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ہندوستان اور خاندان اجتہاد کا افتخار ہے کہ آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی طاب ثراہ ان انگشت شمار افراد میں تھے اور یہ ہندوستان کی جاہلانہ اور رقیبانہ فضا کی بدبختی تھی کہ عوام اس حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے بلکہ اس دیار کے تہا مجتہد اعظم کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہے۔

آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار علی نقی طاب ثراہ کو اس صدی کے بعض عظیم ترین مجتہدین نے مجتہد قرار دیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ انھیں اجتہاد کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ آیۃ اللہ نائینی کو شیخ مرتضیٰ انصاری اور آخوند خراسانی کی طرح اس صدی کے عظیم ترین مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ آیۃ اللہ ابوالحسن اصفہانی وہ تھے جو مرجع خلافت بھی تھے اور پوری شیعہ دنیا میں ان کی تقلید کی جاتی تھی۔ سرکار ضیاء عراقی بھی اسی پائے کے عالم تھے اور سرکار مفتی احمد علی طاب ثراہ وغیرہ ان کو علم سمجھتے تھے۔ شیخ عبدالکریم حارثی وہ ہیں جنھوں نے قم کے حوزہ علمیہ کی بنیاد رکھی جو آج نجف کے بعد، بلکہ فی الحال نجف سے بھی زیادہ اہم حوزہ علمیہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن سے آیۃ اللہ العظمیٰ محسن الحکیم، آیۃ اللہ العظمیٰ خوی، آیۃ اللہ العظمیٰ خمینی، آیۃ اللہ گلپایگانی، آیۃ اللہ نجفی مرعشی کو، جن کو مرجع سمجھا جاتا ہے، اجازہ اجتہاد حاصل ہے انھیں عظیم ہستیوں نے آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی کو بھی مجتہد مطلق کے لقب سے نوازا ہے اور اس کی گواہی دی ہے کہ ان میں امتیازی شان کے ساتھ ملکہ اجتہاد پایا جاتا ہے۔

(۱) آیۃ اللہ العظمیٰ آقا ئی میرزا محمد حسین نائینی تحریر

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی علی اللہ مقامہ کا مرتبہ اس دور کے علم مجتہدین یعنی آیۃ اللہ ابوالقاسم خوی اور آیۃ اللہ العظمیٰ خمینی کے پہلو بہ پہلو ہے اور وہ اپنے دور کے ہندو پاکستان کے یگانہ مجتہد اعظم تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان حضرات کو نجف اور قم کا علم نواز ماحول ملا اور سید العلماء کو ہندوستان کے جہل خیز اور علم شکن حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

فقہ کیا ہے؟

قرآن مجید اور حدیث معصومین سے عقل و اجماع علماء کی روشنی میں استنباط کر کے انسان کی عملی زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق (جن میں عبادات، نکاح، طلاق، میراث وغیرہ کے علاوہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ نہیں بچتا) صحیح اسلامی احکام اور اصول کے استنباط اور استخراج کا نام فقہ ہے۔ پوری فقہ کا دار و مدار قرآن، حدیث عقل اور اجماع علماء پر ہے۔ کن طریقوں سے قرآن اور حدیث سے عقل اور اجماع کی روشنی میں احکام کا استخراج کیا جائے اس علم کو اصول فقہ کہتے ہیں۔ جب ایک شخص قرآن اور حدیث پر پوری طرح تسلط حاصل کر لیتا ہے اور ان تمام طریقوں پر حاوی ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ احکام شریعت کو استنباط کیا جاتا ہے تو اس میں ملکہ اجتہاد پیدا ہو جاتا ہے۔

ملکہ اجتہاد پیدا ہونے میں نہ فقط علم کافی ہے نہ غیر معمولی ذہانت بلکہ یہ ملکہ علم اور ذہنی خلافت کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔

مجتہد ہونا آسان نہیں

یوں بقلم خود کوئی بھی اپنے کو مجتہد لکھ دے یا ہم جس کو چاہیں اس نعمت سے نوازدیں۔ بے شک جہلاء کے حسن کرشمہ

فرماتے ہیں:- بلغ مرتبة سامية من الاجتهاد مقروفة بالصلاح والرشاد۔

”اجتہاد کے بلند درجہ پر حسن عمل کے جوہر کے ساتھ پہنچ گئے۔“

(۲) اس پر دوسرے علم وقت آیۃ اللہ حاج شیخ عبدالکریم یزدی مجتہد قم (ایران) نے تصدیق کرتے ہوئے لکھا:- صح مارقمہ دامت برکاتہ

”جو انھوں نے تحریر فرمایا درست ہے۔“

(۳) آیۃ اللہ حاج شیخ محمد حسین اصفہانی استاد سرکار خوئی مدظلہ:- فاز بالمراد و جاز مرتبة الاجتهاد۔

”اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور درجہ اجتہاد پر فائز ہو گئے۔“

(۴) آیۃ اللہ سید ابراہیم معروف میرزا آقائی شیرازی:- صعد ذروة الاجتهاد مشفوعة بالصلاح و السداد ضليعا عبر الفروع الى الاصول وتطبيق الدليل على المدلول۔

”اجتہاد کی بلند چوٹی پر پہنچ گئے جس کے ساتھ حسن کردار کا جوہر بھی موجود ہے اور وہ فروع فقہ کو اصول کی طرف راجع کرنے اور دلیل کو مدلول پر منطبق کرنے میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔“

(۵) آیۃ اللہ شیخ ضیاء الدین العراقی:- جدو اجتهد الى ان بلغ مراقبه و وصل الى مرتبة الاجتهاد والاستنباط۔

”جدو جہد کرتے رہے، یہاں تک کہ مراتب بلند اور اجتہاد و استنباط کے درجہ تک پہنچے۔“

(۶) آیۃ اللہ الشیخ ہادی آل کاشف الغطاء:- فاق

الاقران وحاز قصب الرهان فاصبح بحمد الله من اهل الملكات القدسية والاجتهاد في الامور الشرعية ممن لا يجوز له ان يقول على غيره في الاحكام الدينته وممن يجب تنفيذ ما يصدر عنه من الاحكام في الحلال والحرام۔

”ہمسروں سے فوقیت لے گئے اور سبقت کا امتیازی نشان حاصل کیا اور اس طرح بفضل خدا ان افراد میں داخل ہو گئے جو فقہی مسائل میں اجتہاد کا ملکہ رکھتے ہیں اور جن کے لئے احکام دینیہ میں دوسرے کی رائے پر عمل جائز نہیں ہے اور جن کے جاری کردہ احکام کا حلال و حرام میں نفاذ لازم ہے۔“

(۷) آیۃ اللہ میرزا علی، یزدانی مجتہد نجف اشرف:- بعد الاختبارات النامة المتاكدة والمباحثات العلمية في المجالس عديدة اخرها يوم الخميس الثالث والعشرين من شهر جمادى الثانية سنة الف وثلثائة وتسع واربعين في دارنا الواقعة في ارض الغرى اتضح عندى انه صاحب ملكة واقتدار وله اهلية الاستنباط وقوة رد الفروع الى الاصول فهو مجتهد مجاز في الاخذ بما ادى اليه نظره الشريف وترك طريقة التقليد۔

”بڑے مکمل امتحانات اور علمی مذاکرات کے بعد جو کئی نشستوں میں ہوئے، جن میں کی آخری روز پنجشنبہ ۲۳/ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ کو ہمارے مکان واقع نجف اشرف میں تھی، مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ ملکہ اجتہاد اور صلاحیت استنباط اور فروع مسائل کو اصول دلائل کی طرف راجع کرنے کی قوت رکھتے ہیں لہذا وہ مجتہد ہیں اور انھیں اجازت ہے کہ جو کچھ ان کا فتویٰ ہو اس پر عمل کریں اور تقلید کے راستے کو ترک کریں۔“

(۸) آیۃ اللہ شیخ محمد حسین طہرانی:- رأيت بعض ما

ترشح من قلمہ الشریف فقہ بہ ناظری وارتاح له
خاطری وتحقق عندی انه فائز بدرجۃ الاستنباط
والاجتهاد حائز للملکۃ والاقتدار وقوة رد الفروع الی
الاصول واستخراج المنقول۔

”میں نے بعض ان کے قلمی نتائج دیکھے تو میری آنکھیں
خنک ہو گئیں اور دل ان سے بالیدہ ہو گیا اور مجھ پر یہ ثابت
ہو گیا کہ مرتبہ استنباط و اجتہاد تک پہنچ گئے ہیں اور ملکہ اجتہاد
اور فروع کو اصول کی طرف راجع کرنے اور معقول کو منقول
سے برآمد کرنے کی قدرت کے حامل ہیں۔“

(۹) آیۃ اللہ شیخ محمد کاظم شیرازی مجتہد نجف:- وصل
الغایۃ وبلغ النہایۃ فاصبح بعون اللہ وتوفیقہ من العلماء
الاعلام المجتہدین وفاز ابرتۃ الاجتہاد والاستنباط۔
”انتہائی منزل تک پہنچے اور بحمد اللہ علماء و مجتہدین میں
داخل ہو گئے اور مرتبہ استنباط و اجتہاد تک پہنچ گئے۔“

(۱۰) آیۃ اللہ میرزا ابوالحسن مشکینی:- اصبح بحمد
اللہ ومنہ من العلماء الاعلام والمجتہدین الفخام۔
”بفضل خدا وہ علماء اعلام اور مجتہدین بلند مرتبہ میں
داخل ہو گئے۔“

(۱۱) سلطان المجتہدین مولانا سید سبط حسین مجتہد اعظم
ہندوستان:- بلغ الذرۃ السامیۃ والدرجۃ القاصیۃ
الاوہی درجۃ الاجتہاد التی بہا حرم التقليد وساغ
العمل بفتواہ۔

”اوپنی چوٹی اور بلند مرتبہ میں داخل ہو گئے اور وہ درجہ
اجتہاد ہے جس کی وجہ سے ان پر تقلید حرام ہو گئی اور ان کے
فتوے پر عمل جائز ہو گیا۔“

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی طاب ثراہ ہندوستان و پاکستان

میں اس دور کے واحد مجتہد ہیں جن کا رسالہ علمیہ شائع ہوا اور
ہندوستان اور پاکستان (خاص طور پر پنجاب پاکستان) میں ان
کے بکثرت مقلدین تھے۔ مختلف فقہی مسائل کے بارے میں
ان کے اپنے نظریات تھے۔ ان کے فقہی نظریات کا مطالعہ اور
فقہ میں ان کی روش کا تجزیہ ایک اہم موضوع ہے جس پر آئندہ
بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن چونکہ یہ فی فی مباحث ہیں جن کا تعلق
فقہاء سے ہے اس لیے یہاں ہم ان کے تذکرے سے پرہیز
کرتے ہیں۔

فقہ میں سرکار سید العلماء کے فتاویٰ ”وجیزۃ الاحکام“
کے نام سے شائع ہوئے جو توضیح المسائل کے انداز کی کتاب
ہے۔ پاکستان میں تحفۃ العوام کے جتنے مکمل ایڈیشن شائع
ہوئے ان میں آیۃ اللہ بروجردی، آیۃ اللہ حکیم، آیۃ اللہ خوئی،
آیۃ اللہ خمینی کے ساتھ سید العلماء آیۃ اللہ علی نقی کے فتاویٰ بھی
شامل ہیں، جن پر آپ کے مقلدین عمل کرتے تھے۔

(یہ دوسری بات ہے کہ لکھنؤ سے شائع شدہ تحفۃ العوام
میں سید العلماء کے فتوے شامل نہیں ہیں۔ اس مسئلہ میں بھی
سرکار سید العلماء نے معصومین ہی کی تاسی کی ہے۔ جب اپنے
وطن سے دور مدینے میں پیغمبر اسلام کا ڈنکان بج رہا تھا، اس وقت
ان کا وطن مکہ مشرکین کا خاص گڑھ اور شرک کا گہوارہ تھا۔ یہی
صورت حال سید العلماء کے بارے میں دیکھنے میں آئی۔)

وجیزۃ الاحکام کے علاوہ علم فقہ و اصول میں
سید العلماء نے مندرجہ ذیل گراں بہا کتابیں تصنیف کی
ہیں جن میں اکثر نجف میں شائع ہوئی ہیں اور بعض انشاء اللہ رقم
میں شائع ہوں گی۔

(۱) حواشی علی الرسائل

(۲) حواشی علی المکاسب

(۳) رسالۃ فی نية الصوم

(۴) رسالۃ فی الاجتهاد و التقليد

(۵) الکلام علی الفقہ الرضوی

(۶) تقریرات بحث آیۃ اللہ النائینی فی الاصول

ہندوستان میں آکر یہاں کی ضرورت کے پیش نظر سید العلماء نے ایک وہ کام کیا جس پر نجف اور قم کے علماء نے بھی اس وقت تک توجہ نہیں کی تھی۔ وہ یہ تھا کہ احکام فقہ کا فلسفہ جدید انداز میں جو موجودہ ذہن کے لیے قابل قبول ہو، بیان فرمانا شروع کیا۔ فلسفہ الاحکام پر قدیم علماء نے کتابیں تصنیف کی تھیں مگر ان میں جدید انداز سے مسائل پر بحث نہیں کی گئی تھی۔ ان کا انداز بیان بھی موجودہ ذہن کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ سید العلماء نے دنیاۓ شیعیت میں پہلی بار اس کمی کو دور کیا۔ اس ضمن میں ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے:-

☆ کتاب ”نظام زندگی“ میں انھوں نے تقلید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس اور حج کے مسائل کا پس منظر اور ان کا فلسفہ پیش کیا۔ یہ اپنے انداز کی بے نظیر کتاب ہے، اس کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆ کتاب ”اثبات پردہ“ اس موضوع پر بہت فکر انگیز اور جامع کتاب ہے۔

☆ ”عبادت اور طریق عبادت“ میں اسلامی عبادات کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے غیر اسلامی مکاتب فکر کے مقابلے میں اسلامی شریعت کا اور غیر شیعہ مکاتب کے اعتراضات کے مقابلے میں شیعہ فقہ کے احکام کا خالص علمی اور استدلالی انداز میں دفاع کیا۔ اس ضمن میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کا نام لیا جاسکتا ہے:-

کتاب ’مسلم پرسنل لاء نا قابل تبدیل‘، کتاب ’زندہ سوالات‘، کتاب ’نظام ازدواج‘ اور کتاب ’قانون وراثت‘ میں سرکار سید العلماء نے اسلام دشمن مکاتب فکر کے اعتراضات کے مقابلے میں شریعت اسلامی کا دفاع کیا۔

کتاب ’متعد اور اسلام‘ میں شیعہ فقہ کے اس خاص نظریہ کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور دوسرے مکاتب کے حملوں کے مقابلے میں شیعہ نقطہ نظر کا دفاع کیا گیا۔ اس موضوع پر اس سے جامع کتاب اب تک دنیاۓ اسلام میں نہیں آئی ہے۔

کتاب ’سجدہ گاہ‘ بھی ایک منفرد کتاب ہے جو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء علی نقی اعلیٰ اللہ مقامہ کے فقہ و اصول فقہ اور شریعت اسلامی اور شیعہ فقہ کے دفاع میں یہ وہ کارنامے ہیں جو ان کو اس صدی کے عبقری مجتہدین کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں۔ اور ان کی اہمیت کا اندازہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوگا۔

علم تفسیر اور قرآن فہمی کے سلسلے میں

سید العلماء کے کارنامے

قرآن کریم دین فہمی کا سرچشمہ اصل ہے۔ تمام دوسرے علوم، اسلامی احکام، اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی بنیاد قرآن کریم ہے۔ لیکن مسلمانوں کی بڑی بد قسمتی تھی کہ صدر اسلام کے بعد جب انحطاط کا دور آیا تو اس دور میں علماء اور عوام دونوں قرآن سے دور ہو گئے۔

علماء فقہ، اصول فقہ، فلسفہ، منطق، ادب اور حدیث وغیرہ کو اصل اہمیت دینے لگے لیکن تفسیر قرآن کو درسیات کا جز نہیں بنایا جب کہ عوام نے قرآن مجید کو جو زندگی کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتا تھا اور جس کی تعلیمات سے آشنا ہو کر عملی زندگی

کے فن میں وسعت پیدا ہوئی۔

اور بھی اس دور اور دور کے ادوار میں اہلبیت اور شیعہ علماء نے لاتعداد تفسیریں لکھیں۔ کیونکہ تفسیر لکھنے والوں میں بعض علم نحو کے استاد تھے بعض علم کلام کے، بعض فلسفے کے اور بعض تصوف کے شیدا۔ اس لیے بعض قدیم تفسیروں میں یہ عیب ہے کہ مفسر کوشش کرتا ہے کہ آیات قرآن کو کھینچ تان کر اپنے ذوق یا اپنے تفکرات اور نظریات کے مطابق کر دیں، قرآن مجید کو ویسا سمجھیں جو ہمارے ذوق اور طرز فکر کا تقاضا ہے نہ یہ کہ ہم اپنے ذوق اور طرز فکر کو ویسا ڈھالیں جیسے قرآن کا تقاضا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو ہندوستانی معاشرے میں ہم نے ناطق قرآنوں کی تفسیر کے سلسلے میں بھی اپنا رکھا ہے۔ یعنی امیر المومنین، امام حسین علیہ السلام اور دیگر معصومین کو ویسا سمجھنے کے بجائے جیسے کہ وہ تھے اور پھر اپنے طرز فکر اور ذوق کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ امیر المومنین اور شہید کربلا کو ویسا سمجھیں جیسا ہمارا دل چاہتا ہے، اور اگر اس کے برخلاف کوئی معتبر کتابوں سے یا نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ سے کوئی بات درج کی جائے تو اس کو نظر انداز کر دیں یا اس پر ہنگامہ برپا کریں۔

آیۃ اللہ العظمیٰ علی نقی طاب ثراہ کا نظریہ یہ تھا کہ تفسیر صرف قرآن کی تشریح پر مبنی ہونا چاہیئے یہ کہ مختلف مباحث چھیڑ کر قرآن کریم کی آیات کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔ یہ سرکار کی تفسیر کی اہم خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت نکتہ آفرینی، باریک اندیشی اور خالص شیعہ نقطہ نظر کا انعکاس ہے۔ جہاں اسلام میں جو ہمارے دور میں دوسری بڑی تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں ان عناصر کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ سرکار کی تفسیر اردو داں شیعوں کے

میں عمل کرنے کی ضرورت تھی، اس کو صرف ثواب حاصل کرنے اور مردوں کے لیے ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنالیا۔ قرآن مجید کو عملی زندگی سے شہر بدر کر کے قبرستان پہنچا دیا، بجائے اس کے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کریں، صرف طاق کی زینت اور بیماروں کو ہوا دینے نیز مسافروں کو اس کے نیچے سے نکالنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ اس بات کی کوشش نہیں ہوئی کہ عوام قرآن کریم کے مفاہیم سے واقف ہو سکیں۔

آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی طاب ثراہ نے اس کمی کو محسوس کیا اور اس کی مہم شروع کی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر منظر عام پر آئے۔ اس مقصد کے پیش نظر امامیہ مشن نے قرآن مجید کا ترجمہ مع حواشی شائع کیا۔ پہلی مرتبہ اس پائے کے کسی عالم نے یہ توجہ کی تھی کہ قرآن مجید کا ترجمہ، تفسیر اور موضوع پر اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت ہو۔ اس سے پہلے ایک دور یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے علماء قرآن مجید کے اردو ترجمہ کے ہی مخالف تھے۔

اس کے بعد سرکار نے تفسیر کی طرف توجہ کی۔ تفسیر کا علم صدر اسلام ہی سے شروع ہوا اور تمام دوسرے اسلامی علوم کی طرح اس کا سرچشمہ بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ لیکن ابتداء میں اسلام چونکہ عرب زبان افراد ہی میں محدود تھا اس لیے تفسیر کے نام سے کسی الگ علم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ تاریخ اسلام میں حدیث کا علم تفسیر کے علم سے قبل معرض وجود میں آیا اور ابتدا میں تفسیر حدیث ہی سے منشعب تھی۔ یعنی جو احادیث مختلف آیات قرآنی کے بارے میں ہوتی تھیں ان کو جمع کرایا جاتا تھا۔ پھر جب عباسی دور میں علم کلام اور فلسفہ کا چرچا ہوا تو تفسیر

لیے آئندہ قرآن فہمی کے سلسلے میں مشعل راہ ثابت ہوگی۔
ترجمہ قرآن، مقدمہ تفسیر اور پھر تفسیر کی سات ضخیم جلدوں کے علاوہ سید العلماء نے علوم قرآن کے متعلق بعض اہم کتابیں تصنیف کیں جن میں ایک قرآن کے بین الاقوامی ارشادات اور ایک قرآن مجید کے انداز گفتگو میں معیار رواداری شامل ہیں۔

آپ کی ایک شاہکار تصنیف ”تحریف قرآن کی حقیقت“ ہے۔ جب شیعوں پر وہابیوں کی طرف سے یہ الزام لگا کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں تو سرکار سید العلماء نے شیعیت کا دفاع کیا۔ اسی طرح جب کہا گیا کہ شیعوں نے قرآن کی حفاظت اور حفظ کے سلسلے میں خدمات انجام نہیں دیں، اور یہ کہ شیعوں میں حافظ قرآن نہیں ہوتے، تو سرکار نے ایک دوسری عظیم الشان تحقیقی کتاب لکھی۔ جو اس موضوع پر پوری دنیائے اسلام میں تنہا اور یگانہ کتاب ہے۔ اس کتاب کا نام ”تذکرہ حفاظ شیعہ“ ہے۔ اس میں سینکڑوں شیعہ حافظان قرآن کے حالات پیش کر کے اس خیال کو باطل کر دیا گیا ہے کہ شیعوں میں حافظ نہیں ہوتے۔

اس طرح سید العلماء نے نہ فقط قرآن فہمی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں بلکہ ہر میدان میں شیعیت کا دفاع کیا ہے۔

عقائد شناسی اور علم کلام میں سید العلماء

کے کارنامے

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی نقوی مرحوم کا ایک عظیم کارنامہ ان کی وہ کاوشیں ہیں جو اصول دین اور اسلامی اور شیعہ عقائد کو جدید دلائل سے ثابت کرنے کے سلسلے میں انھوں نے فرمائیں۔ اس میدان میں سید العلماء نجف اور قم کے عظیم الشان علماء سے بھی سبقت لے گئے۔ وہ لوگ پوری پوری

عمریں فروع دین، احکام اور عبادات کی بحثوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن اصول دین کو استدلالی طور پر پیش کرنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ اس دور میں جب اکثر افراد پابند مذہب ہوتے تھے اور ان کے ذہنوں میں اصول دین کے سلسلے میں کوئی سوال یا خلش ہی نہیں ہوتی تھی تو یہ طریقہ صحیح تھا کہ تمام تر توجہ فقہ و اصول فقہ میں محدود رکھی جائے۔ لیکن اب جب کہ مذہب کی ضرورت، خدا کے وجود، پیغمبری حقانیت اور معجزات، ائمہ کی عصمت، ظہور مہدی کے وجود اور قیامت کے مفہوم ہی کو بہت سے جدید ذہن شک و شبہ سے دیکھتے ہیں تو علمائے اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ سب سے زیادہ توجہ عقائد کو استدلالی طور پر ثابت کرنے کی طرف دیں۔

قدیم دور میں جب یونان کے فلسفے اور مسیحی اور بدھشٹ، مانوی اور مزدکی خیالات کی اسلام پر یورش ہوئی تھی تو قدیم علماء نے علم کلام ایجاد کیا تھا۔ اصول دین اور عقائد کو منطقی دلائل اور فلسفیانہ استدلال سے ثابت کرنے کو علم کلام کہتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں اسلام کو یونانی فلسفہ اور مزدکی تصورات کی یورش کا سامنا نہ تھا بلکہ جدید مغربی مکاتب فکر جن میں مارکزم علم پرستی، مادہ پرستی وغیرہ سرفہرست تھے، اسلام پر حملہ آور ہوئے تھے، اس لیے اسلامی عقائد ثابت کرنے کے لیے علم کلام کے پرانے دلائل نا کافی تھے اور نئے انداز کے استدلال کی ضرورت تھی۔

سید العلماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ حالانکہ نجف اشرف میں ان کی تحقیقات اور مطالعات کا اصل محور فقہ اور اصول فقہ تھے لیکن ہندوستان واپس آ کر انھوں نے اپنی تقریر اور تحریر میں اصل محور اصول دین کو استدلالی طور پر پیش کرنے کو بنالیا۔ انھوں نے تمام اسلامی اور شیعہ عقائد کو اس طرح تازہ

استدلالات کے ساتھ پیش کیا کہ وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول ہو سکیں۔

اگر سید العلماء نہ ہوتے تو ہندوستان کی ایک پوری کی پوری تعلیم یافتہ نسل دین و مذہب سے دور ہو چکی ہوتی۔ جب مستقبل کا مورخ سید العلماء کی تحریروں اور تقریروں کا مطالعہ کرے گا تو اس کو اندازہ ہوگا کہ علم کلام کے مختلف مباحث مثلاً مذہب کی ضرورت، توحید، عدل، نبوت اور امامت وغیرہ کو ثابت کرنے کے سلسلے میں نہ معلوم کتنے تازہ دلائل اور استدلالات ہیں جس کا آپ نے اسلامی اور شیعہ علم کلام میں اضافہ کیا ہے، اس وقت زمانے کو احساس ہوگا کہ سید العلماء کا شمار تاریخ کے چند صف اول کے مسلمان اور شیعہ متکلمین میں ہے۔

عقائد شناسی اور علم کلام میں آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی طاب ثراہ کی تحریروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی موضوع تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ جب ہندوستان کے بیشتر اہل قلم اور اہل منبر گولر کے کیڑے کی طرح گھوم پھر کر سقیفہ ہی میں پھنسے ہوئے تھے، اس وقت سید العلماء نے ایک طرف 'خلافت و امامت' جیسی کتاب لکھ کر اس قضیہ کا بھی علمی لحاظ سے فیصلہ کر دیا، دوسری طرف مذہب کی ضرورت، خدا شناسی، مادہ پرستی کی رد، قیامت کے اثبات اور نبوت و امامت کے متعلق شکوک و شبہات دور کرنے پر اپنا زور قلم صرف کیا۔

سید العلماء نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کر لیا کہ ایک ایسے ہنگام میں جب مادہ پرستی کا طوفان طغیانی کر رہا ہے اور جوان نسل دین ہی چھوڑ رہی ہے اور مذہب کی کشتی میں سوراخ ہو چکا ہے، تمام وقت اس بحث میں گزارنا کہ پتواریس کے ہاتھ میں ہو، تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر اس طرز عمل کے نتیجے میں آئندہ نسلیں شیعیت اور اسلام سے دور ہو جائیں تو

تاریخ اس دور کے اہل قلم اور اہل منبر مفسدوں کو جنھوں نے اس غلط رجحان کو ابجا دیکھا، نیز کم ہمت، سیاست باز قاسدین کو جو اپنے اقتدار یا حفظ شہرت و مقام کی خاطر اس غلط رجحان سے نبرد آزما ہونے سے بچتے رہے، نتیجتاً اس رجحان کے ممدو معاون ثابت ہوئے، کبھی نہیں بخشے گی۔

سید العلماء نے عقائد شناسی میں اتنے وسیع پیمانہ پر کام کیا ہے جو اس دور میں کسی اس پائے کے عالم نے انجام نہیں دیا۔ مذہب کی ضرورت اور اسلام و شیعیت کے مفہوم کے بارے میں انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:-
(۱) مذہب کی ضرورت (۲) مادیت کا علمی جائزہ
(۳) مذہب اور عقل (۴) لارڈ رسل کے ملحدانہ خیالات کی رد
(۵) اسلامی عقائد (۶) الدین القیم (۷) اسلام کی حکیمانہ زندگی (۸) اصول دین اور قرآن (۹) اسلام اور انسانیت
(۱۰) عالمی مشکلات کا حل (۱۱) اصول اور ارکان دین
(۱۲) اسلام کا پیغام پس افتادہ اقوام کے نام (۱۳) نظام تمدن اور اسلام۔

شیعیت کے تعارف اور استدلالی طور پر اس کے عقائد کے دفاع میں آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:-

شیعیت کا تعارف، مذہب شیعہ ایک نظر میں، النجعة فی اثبات الرجفة، مسلمانوں کی نقلی اکثریت۔

دوسرے فرقوں اور مذاہب کی رد میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:-

الرد القرآنیہ علی الکتب المسیحیہ، مذہب باب وبہا، کشف النقاب عن عقائد عبد الوہاب، البيت المعمور فی عمارة القبور، دو اسلام پر ایک نظر۔
خدا کے وجود کے ثابت کرنے اور توحید کے مفہوم کے

بارے میں مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:-

توحید، تلخیص عماد الاسلام، خدا اور مذہب، خدا پرستی اور
مادیت کی جنگ، خدا کا ثبوت، خدا کی معرفت، صنائع کردگار،
ذات وصفات۔

عدل الہی کے بارے میں یہ کتابیں لکھیں:-

عدل، جبر و اختیار، مسئلہ فی الخیر والشر۔

نبوت کے اثبات کے لئے ’کتاب نبوت‘، کتاب ’ختم
نبوت‘ کتاب ’مسئلہ حیات النبی‘ اور ’واقعہ وفات رسول‘
تحریر فرمائی۔

امامت کے بارے میں کتاب ’خلافت و امامت‘ حرف
آخر ہے۔

اس سے بہتر کتاب عراق و ایران بلکہ پوری دنیائے
اسلام میں موجود نہیں ہے۔

سید العلماء نے ایک ایسے وقت ائمہ اطہار کی زندگی کا
تحلیلی مطالعہ شروع کیا، ان کی تعلیمات کو اجاگر فرمایا اور ائمہ کی
سیرت سے عملی درس لینے کی ضرورت پر زور دیا جب سیرت
ائمہ کے متعلق تمام تحریروں اور تقریروں میں صرف ان کے
معجزات کا ایسے انداز میں تذکرہ ہوتا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ
لوگوں کی نظر میں ائمہ اطہار سے دل بستگی کم ہو رہی تھی۔

امامت اور ائمہ اطہار کے بارے میں سید العلماء نے
مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں:-

امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن، معراج انسانیت:
سیرت رسول اور آل رسول کی روشنی میں، رہنمایان اسلام،
تاریخ اسلام (چار جلدیں)، مطلوب کعبہ، مولود کعبہ، مقصود
کعبہ، رہبر کامل، ابوالائمہ کے تعلیمات، در روز غدیر: حضرت
علی کی شخصیت علم و اعتقاد کی منزل میں، تاجدار کعبہ، حدیث

حوض، سیدہ عالم، السبطان فی موقفیہما، امام حسن مجتبیٰ،
معراج انسانیت: سیرت حسنین کی روشنی میں، امام زین
العابدینؑ، صحیفہ سجادہ کی عظمت، پانچویں امام: صادق آل محمد،
نویں امام، گیارہویں امام، وجود حجت۔

(امام حسین علیہ السلام پر اتنی زیادہ کتابیں ہیں کہ ان کا
تذکرہ آئندہ فصل میں آئے گا۔)

ان کتابوں کے علاوہ آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی طاب ثراہ
کی سیکڑوں تقریروں میں ان تمام اصول اور عقائد دینی کو بالکل
تازہ اور مستحکم دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ
جب سید العلماء کی تقریروں کے ۳۰ مجموعے شائع
ہو جائیں گے (جس کا ارادہ ہے) تو اندازہ ہوگا کہ سید العلماء
کی علم کلام میں کتنی عظمت ہے اور اسلامی اور شیعہ عقائد کے
ثابت کرنے کے لئے انھوں نے کتنی نئی راہیں پیدا کی ہیں،
اور اس سلسلہ میں اس کا کیا رول رہا ہے۔

سرکار سید العلماء کی تحریکیں

(۱) وہابیت کے خلاف تحریک

وہابیت اس دور کا بہت بڑا فتنہ ہے۔ یہ تحریک شیعیت و
تسنن دونوں کے خلاف ہے۔ اصل وہابیت کے بانیوں کی
تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نہ فقط شیعوں کو
دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں بلکہ اہل سنت کی اکثریت کو
بھی اسلام سے خارج اور واجب القتل گردانتے ہیں۔ یہ
دوسری بات ہے کہ اس وقت کا وہابی نظام سیاسی مصالح کی بنا
پر اپنے اس عقیدے کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

نہ فقط ہندوستان اور پاکستان بلکہ پوری دنیا میں
مسلمانوں کی اکثریت خفی المسکک اور تصوف کے مختلف سلسلوں
سے منسلک ہے جب کہ وہابیت تصوف کو کفر و شرک قرار دیتی ہے

اور یہ لوگ حنفی حضرات کو بھی نظریاتی طور پر واجب القتل سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہابیت نے اپنا خاص نشانہ شیعیت اور شیعوں کو بنایا ہے۔ جزیرۃ العرب میں وہابی حکومت کے قائم ہونے کے بعد جب ان لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی محبوب ہستی جناب سیدہؑ اور دوسری مقدس ہستیوں کے مزارات کو منہدم کیا اس وقت یہ آیۃ اللہ العظمیٰ علی نقیؑ مرحوم ہی تھے جنہوں نے وہابیت کے خلاف ہندوستان میں پہلی بار تحریک شروع کی۔

جب جنت البقیع کو (جس میں جناب سیدہؑ کے علاوہ چار اماموں (امام حسن علیہ السلام، امام زین العابدین علیہ السلام، امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام کے روضے تھے) منہدم کیا گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں خصوصاً شیعوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ سعودی حکومت کی شہ پر ہندوستان کے وہابی عناصر نے بھی سراٹھایا۔ ظفر علی خاں کا اخبار ”زمیندار“ اس جنگ میں پیش پیش تھا۔ اس موقع پر مشائخ صوفیا اور علمائے فرنگی محل شیعوں کے ساتھ تھے۔ فرنگی محل میں انجمن خدام الحرمین قائم ہوئی، جس کے سرپرست اس وقت کے سربر آوردہ عالم مولانا عبدالباری صاحب تھے۔ علی برادران ابتدا میں ابن سعود کے حامی رہے۔ لیکن سفر حج سے واپس آ کر مولانا محمد علی نے کچھ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کی اور رفاہ عام میں جو عظیم الشان حجاز کانفرنس ہوئی اس میں علمائے شیعہ، مشائخ صوفیہ اور علمائے فرنگی محل کے ساتھ مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی شریک ہوئے اور تقریریں کیں۔ اس وقت علمائے عظام میں سرکارِ نجم الملت پیش پیش تھے۔ شیعوں کی طرف سے سرکارِ نجم الملت کی سرپرستی میں وہابیت کے خلاف تحریک شروع ہوئی اس تحریک میں سید العلماء اپنے استاد نجم الملت طاب ثراہ کے قوت بازو تھے۔ جب وہابی جرائد میں اس طرح

کے مضامین شائع ہوئے جن میں کچھ شیعہ کتب کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ شیعہ کتب میں بھی قبور کی تعمیر کی مخالفت ہے تو نجم الملت اعلیٰ اللہ مقامہ نے سرکار سید العلماء ہی سے اس کے جواب کے سلسلے میں رجوع کیا اور سید العلماء نے معرکتہ الآراء کتاب ”البيت المعمور فی عمارة القبور“ تحریر فرمائی۔ جو نور المطالع میں شائع ہوئی اس سے علمی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا اور تمام شیعہ اور سنی جرائد میں اس پر تبصرے ہوئے۔ اس کے بعد نجم الملت نے سرکار کو مامور فرمایا کہ جبل عامل کے علماء کی ایپلوں کو اردو داں حلقے کے لئے مہیا کیا جائے نیز یہ کہ عربی میں ایک اپیل ہندوستانی علماء کی طرف سے شامل کی جائے یہ تحریریں فریاد مسلمانان عالم کے نام سے طبع ہوئیں۔ شیعہ اور سنی حلقوں میں مولانا محمد علی کی یہ تجویز زیر غور آئی کہ وہابی مظالم کے خلاف احتجاج کے طور پر چند سال کے لیے حج ملتوی کر دینا چاہئے۔ مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ اگر چند سال مسلمان حج کے لیے نہ جائیں تو حکومت حجاز کی اقتصادی طور پر کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ مسلمانوں کے سامنے سپر انداختہ ہو جائے گی۔ اس پر وہابی اخبارات نے آسمان سر پر اٹھالیا کہ حج مثل نماز، روزے کے ایک فریضہ ہے اس کو ملتوی کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس مرحلے پر بھی سرکار سید العلماء کا قلم ہی تھا، جس نے وہابیوں کو دندان شکن جواب دیا۔ سید العلماء نے کافی کاوش سے پوری تاریخ اسلام کو کھنگال ڈالا اور ثابت کیا کہ اس سے پہلے بھی مختلف ادوار میں علماء نے وقتی حالات کی بنا پر حج کے ملتوی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مضمون فرنگی محل کی انجمن ”خدام الحرمین“ نے شائع کر کے پورے ہندوستان میں تقسیم کروایا۔

سرکار کی مفصل کتاب ”کشف النقاب عن عقائد

ہوئے تب سے برابر اتحاد بین المسلمین کے نقیب رہے۔
مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا اور باہمی رواداری کی تبلیغ کرنا ہی
آپ کا نصب العین بن گیا۔

سید العلماء نے پچاس سال قبل مدرسۃ الواعظین کے
منبر سے ’لا نفسدوا فی الارض‘ کے موضوع پر تقریریں
کیں، جو کتابی انداز میں تین مرتبہ شائع ہوئیں۔ سرکار
سید العلماء ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ اس سے انکار
نہیں کہ شیعہوں اور سنیوں کے عقائد میں بعض بنیادی اختلافات
ہیں، اس کے باوجود اختلاف کے مقابلے میں وحدت کے پہلو
زیادہ ہیں۔ دونوں توحید و رسالت کے قائل ہیں، دونوں کا
رسول ایک، قبلہ ایک، عبادت میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، خمس
دونوں کے یہاں ارکان دین میں ہیں۔ دونوں کی تہذیب ایک
ہے پھر نفرت اور جنگ کیوں اور خونریزی کی کیا وجہ ہے۔ اہل
سنت کو بھی شیعہوں کے دلائل اہل بیت پر کوئی اعتراض نہ ہونا
چاہئے۔ کیونکہ تمام فرق اسلامی اہل بیت کی دلاء کو جزو ایمان
سمجھتے ہیں اور اس کے لیے امام شافعی کے مشہور اشعار کافی
ہیں۔ یہ ہے کہ مشترک مسائل پر تحریر و تقریر میں تائید کی جائے
اور اختلافی مسائل کو اگر پیش کیا جائے تو خالص علمی لب و لہجہ
میں، اور دل آزاری سے پرہیز کیا جائے۔ بقول صفی لکھنوی:

نہ شیعہ ہوں سنی نہ سنی ہوں شیعہ

ترقی کا اسلام کی ہوں ذریعہ

سید العلماء کا پچاس سال سے اب تک یہ پیغام رہا
لیکن، ایران کے اسلامی انقلاب سے پہلے کی فضا میں فساد کے
بادل اس طرح لکھنؤ کے افق پر محیط تھے کہ نہ شیعہ اس پیغام کو
ٹھنڈے دل سے سننے پر آمادہ تھے اور نہ سنی۔ ان حالات میں
۱۹۳۷ء میں سید العلماء کا ایک تاریخی مقالہ اخبار عدالت میں

عبدالوہاب ”اسلامی دنیا میں وہابیت کا پہلا علمی جواب ہے جس
میں وہابیوں کے تمام عقائد کے باطل ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔

اس طرح سرکار سید العلماء کا قلم ہندوستان میں وہابیت
کے فتنے کے خلاف تحریک میں پیش پیش رہا اور آپ کے علم اور
ذہنی خلّاقیت نے اس تحریک کو فکری بنیادیں فراہم کی ہیں۔

(۲) اتحاد بین المسلمین کی تحریک

”اتحاد بین المسلمین“ نہ فقط وقت کی اہم ضرورت بلکہ
نظریاتی اعتبار سے اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ پیغمبر اسلام
نے اسلامی ”امت“ کا سنگ بنیاد رکھا۔ قرآن کریم اور
احادیث رسول میں مسلمانوں کے اتحاد پر انتہائی تاکید کی گئی،
امیر المومنین اور تمام ائمہ کی سیرت نے ہم کو اتحاد کی اہمیت
سکھائی امیر المومنین علیہ السلام نے وہ جس کی شمشیر نے بدرو
احد و خندق و خیبر میں پرے کے پرے صاف کر دیئے تھے،
مسلمانوں کے اتحاد کی حفاظت کی خاطر شمشیر کو نیام میں رکھ لیا
اور وہ جو ہمیشہ جنگ کے میدانوں میں نظر آتا تھا وہ اسی مقصد
کی خاطر پچیس سال گوشہ نشین رہا۔ اسی مسلمانوں کے اتحاد کی
خاطر حضرت علی علیہ السلام نے ابوسفیان کی اس پیشکش کو کہ
آپ کو آپ کا حق دلانے کے لئے میں مدینے کی گلی کو چوں کو
سوار اور پیادوں سے بھر دوں گا، حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔
(یہ دوسری بات ہے کہ آج ہم ان کے نا آگاہ بیرواس کو بڑی
فضیلت سمجھنے لگیں کہ حریف کو زیر کرنے کے لئے ناناجی دیش
کھ، جن سنگھ اور کانگریس کی مدد حاصل کریں)۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ آیۃ اللہ العظمی سید علی نقی مرحوم جو حقیقی
اسلام کے مبلغ اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی راہ کے سالک
اور آپ کے پیرو تھے ”اتحاد المسلمین“ کے اصول پر عمل پیرا
نہ ہوتے۔ جب ۱۳۵۰ھ میں آپ نجف اشرف سے واپس

شائع ہوا جو بڑا تاریخی ہے اور اس کے ہم مختصر اقتباسات دیتے ہیں، سرکارِ قطر از ہیں۔

میری صدا بے ہنگام، میرا نغمہ بے آہنگ، اور میرا پیغام بے محل سمجھا جائے گا، موسلا دھار طوفانی بارش میں فوارہ کی ریزش، بدبودار، کثیف و غلیظ نالوں کے بیچ میں بھینی بھینی پھولوں کی خوشبو، اور نقار خانے میں طوطی کی آواز جاذب توجہ نہیں ہو سکتی۔ افتراق کی ہوا اور باہمی آویزشوں کی فضا میں میرے اتحاد کے پیغام پر کون کان دھرے گا۔۔۔ مگر میں کیا کروں کہ میرے دماغ کی فضاء میرے دل کی گہرائی، میرے سینے کی وسعت، اور میرے احساسات کے ایوان سب اسی کے نغمے سے معمور ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو یہی سمجھ میں آتا ہے، لکھتا ہوں تو یہی قلم سے نکلتا ہے اور بولتا ہوں تو یہی زبان سے جاری ہوتا ہے۔

میں نے مہینوں پہلے صلح و آشتی کی صاف و شفاف فضاء میں فساد کا نقشہ دیکھا اور سناٹے میں آندھی کے جھکڑ دکھائی دیئے تو میں نے پکارا ”لا تفسدوا فی الارض“ دس دن تک چیختا رہا آواز فضاء میں گم ہو گئی، میں تھک کر خاموش ہو گیا۔ لیڈروں نے توجہ نہ فرمائی اور فرزندِ ان ملت نے التفات نہ کیا۔

اس نصب العین کی بنا پر مفسدین فی الارض نے آپ کو روادار کہہ کر اس نظریہ پر حملے شروع کرائے اور آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پورے پچاس سال بعد جب ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد آیۃ اللہ خمینی نے اتحادِ بین المسلمین کی تحریک شروع کی تو وہی مفسد عناصر اپنے منافع کی خاطر، یا ”چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی“، کے نظریہ کی

بناء پر اتحاد کی باتیں کرنے لگے اور وہی جو مسلمانوں کے قتل و خوں کے ذمہ دار تھے، تہران جا کر شیعہ سنی اتحاد کے چارٹر پر دستخط کر کے آگئے۔ یہ (ہے) حق کی ناگزیر فتح کا مفہوم۔ جب نقار خانے کی بے آہنگ صدائیں تھمتی ہیں تو طوطی کی شیریں بیانی ہی دل موہتی ہے۔

الحمد للہ، اب اکثر رہبران قوم اتحاد کے مقصد کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ لیکن اب بھی وہ مفسد عناصر جن کے دلوں پر خدا نے مہر کر دی ہے اتحاد کے نظریے کی مخالفت اور فتنہ انگیزی میں مشغول ہیں۔ لیکن یہ افراد تاریخ کے دھارے میں بہہ جائیں گے، اس وقت ”یہ چمن معمور ہوگا نغمہ تو حید سے“۔

(۳) تصنیف و تالیف کی تحریک (امامیہ مشن کا قیام)

ہر زندہ قوم میں تصنیف و تالیف کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ جب تک کوئی مذہب تصنیف و تالیف کے محاذ پر کمزور رہے، وہ دشمنوں کے حملوں کے مقابلے میں بے دفاع رہتا ہے۔ تقریر کے مقابلے میں تحریر کی اہمیت افقی لحاظ سے بھی زیادہ ہے اور عمودی (Vertical) لحاظ سے بھی۔ عمودی لحاظ سے اس لیے زیادہ ہے کہ تاریخ بشر میں وہ نام جو احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں، مثلاً سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن سینا، (خواجہ) طوسی، ملا صدرا وغیرہ۔ یہ سب وہ تھے جنہوں نے تحریریں چھوڑی ہیں۔ کیا اس دور میں شعلہ بیان مقرر نہ ہوں گے؟ لیکن وہ تاریخ کے صفحات سے محو ہو گئے۔ آج ہم کسی بھی گذشتہ تحریک یا مذہب کا مطالعہ کریں تو ہم کو اس دور کی تحریروں ہی پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔ افقی Horizontal لحاظ سے بھی تقریر کا دائرہ تحریر کے مقابلے میں بہت محدود ہوتا ہے، تقریر زیادہ سے زیادہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے مجمع میں ہوگی، کسی خاص زبان بولنے والوں میں،

کسی خاص خطے کے لوگوں میں محدود ہوگی۔ لیکن کتاب ترجمہ ہو کر پوری دنیا میں منتشر ہوتی ہے۔

کسی بھی مذہب اور دین کی حیات اس سے وابستہ ہوتی ہے کہ مخالف حلقوں کے استدلال کے مقابلے میں اس کا استدلالی دفاع کیا جائے جو آئندہ نسلوں کو اس دین و مذہب کی طرف راغب کر سکیں۔

زندہ قوموں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ان میں تالیف و تصنیف اور تحریر کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہ ان کا تکیہ منطقی دلائل، ٹھوس استدلال اور عقلی برہان پر ہوتا ہے۔ مردہ قوموں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ان میں جذبات حاوی ہو جاتے ہیں اور نکتہ آفرینی اور لفاظی، ٹھوس عقلی استدلال کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس لیے تصنیف و تالیف و تحریر پر توجہ کم ہو جاتی ہے اور تقریر کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی شیعوں کی بد قسمتی یہ تھی کہ جب نوائین اور زمینداروں کی عیش کوشی اور انگریزوں کی چالوں سے قوم کا مزاج بگڑا تو قوم کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور تقریروں کا بازار گرم ہو گیا۔

جب اہل سنت میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا مودودی جیسے اہل قلم پیدا ہو رہے تھے اور تحریری محاذ پر شدت سے کام ہو رہا تھا، اس وقت ہندوستان کے شیعوں میں قلمی محاذ پر سٹائنا نظر آنے لگا۔

یہ بات نہ فقط یہ کہ قوم کے مستقبل کے لیے خطرناک تھی بلکہ اس کی ہستی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی، اس لیے کہ ہر طرف سے تحریری حملے ہو رہے تھے اور ہم تحریر کا جواب تقریر سے دے رہے تھے۔ تحریر ہمیشہ رہ جاتی ہے جبکہ تقریر کی صدا فضا میں بکھر کر فنا ہو جاتی ہے۔ اس طرح آئندہ نسلوں کے لیے

حملہ تو رہ جاتے، جواب موجود نہیں ہوتا۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نجف سے واپس آ کر سرکار سید العلماء نے ایک وسیع تصنیف و تالیف کی تحریک چلائی اور کچھ مخلص افراد کے تعاون سے امامیہ مشن قائم کیا۔

امامیہ مشن کا قیام

امامیہ مشن کا قیام اس طرح ہوا کہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ میں عراق سے واپسی ہوئی، اس کے بعد جو محرم آیا تو لکھنؤ میں مولانا عبدالشکور مدیر ”البنم“ نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا کہ ”قاتلان حسین“ شیعہ تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس سے قوم میں بڑی بے چینی تھی اس ضرورت سے اخبار ”سرفراز“ لکھنؤ میں ایک سلسلہ مضامین سرکار سید العلماء کے قلم سے شائع ہوا جو تقریباً سات ۷ نمبروں میں نکلا۔

اس وقت تک مناظرانہ انداز کے مضامین میں عموماً لب و لہجہ سخت ہوا کرتا تھا اور ”قال اقول“ والے انداز میں ایک الجھاؤ بھی ہوتا تھا۔ یہ مضامین جو شائع ہوئے تو عموماً محسوس کیا گیا کہ مناظرانہ مسائل پر علمی انداز میں سنجیدہ بحث کا یہ پہلا نمونہ ہے جو ان مضامین کی صورت میں پیش ہوا ہے، اس لئے قوم میں ان مضامین کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ابن حسین صاحب نقوی اس وقت ایک نوجوان ادارہ ”سرفراز“ میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، انھیں یہ خیال ہوا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے اور اپنے چند احباب کے تعاون سے اسے چھپوانا شروع کر دیا اور ناشر کی حیثیت سے اپنا نام ”سکریٹری امامیہ مشن“ کے الفاظ کے ساتھ لکھ دیا۔ اس طرح ”امامیہ مشن“ کی بنیاد قائم ہو گئی۔

۱۳۵۱ھ ۸ ربیع الاول کے چپ تعزیر کا جلوس تھا جس

میں ابنِ حسین صاحب امامیہ مشن کے اس رسالہ کی گڈیاں بغل میں دبائے ہوئے اسے فروخت کرتے پھر رہے تھے اس کی تفصیل خود امامیہ مشن کی رپورٹوں میں ابنِ حسین صاحب کے قلم سے موجود ہے۔

مولوی عبدالشکور نے اس رسالہ کا جواب لکھا جو ”قاتلانِ حسینؑ کی خانہ تلاشی“ کے نام سے شائع ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح جواب اور جواب الجواب میں الجھا کر ”امامیہ مشن“ کے کام کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکے گا مگر یہاں اُن کے مقصد کو محسوس کر لیا گیا اور بجائے اُس رسالہ کے جواب دینے کے ایک دوسرا رسالہ اس سے بھی زیادہ اہم موضوع ”تحریفِ قرآن“ کے مسئلہ پر جسے مولانا عبدالشکور نے اپنی مناظرانہ زندگی کا محور بنا رکھا تھا شائع کر دیا گیا۔

مستقل جواب دینے کے بجائے جب ”قاتلانِ حسین کا مذہب“ رسالہ کا تیسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو اس میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کر کے ان باتوں کی رد لکھ دی گئی جو بات اپنے جواب میں عبدالشکور نے کہی تھیں۔ پھر انھوں نے دوسرے رسالہ کا جواب لکھا ”تحریفِ قرآن کی خانہ ساز حقیقت“ اور یہاں فوراً تیسرا رسالہ نکال دیا گیا ”وجودِ حجت“۔۔۔۔۔ اس کے بعد مولانا عبدالشکور خاموش ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ ہم اس سلسلہ کو روک نہیں سکتے اور پھر انھوں نے جواب لکھنا چھوڑ دیا۔ یہاں اُن کے اس جواب کے مضامین کی رد ”تحریفِ قرآن کی حقیقت“ کے بعد والے ایڈیشن میں کر دی گئی۔

سرکارِ سید العلماء کی سربراہی میں ”امامیہ مشن“ تنہا ادارہ تھا، جو تصنیف و تالیف کے محاذ پر نہ فقط شیعیت کا ہر طرح کے دشمنوں کے حملوں کے مقابلے میں دفاع کرتا رہا بلکہ شیعیت

کے پیغام اور حسینیت کو دیگر اقوام و مذاہب تک پہنچانے میں بھی مشغول رہا۔ اگر سرکارِ سید العلماء کی ذات اور ”امامیہ مشن“ کی کوششیں نہ ہوتیں تو گزشتہ آدھی صدی سے ہندوستان میں تصنیف و تالیف کے محاذ پر مکمل سناٹا ہوتا۔ ہاں ایسی تحریریں اور کتابیں شائع ہوتی رہتیں جن میں زندہ عصری مسائل کے بجائے ایک دو اعتقادی اور تاریخی مسلوں سے بحث ہوتی اور اُن کا تمام تر سرمایہ معجزات نقل کرنا اور بغیر استدلال جذباتی انداز میں حملہ کرتا ہے۔

یہ تحریر یا کتاب نہیں کہلاتی ہے بلکہ تحریری قالب میں تقریر اور کتاب کی شکل میں مجلس ہے۔ کیا شیعیت کے دفاع کے لئے یہی کافی تھا؟ کیا کبھی ہم نے سوچا ہے کہ اگر سید العلماء کا قلم نہ ہوتا تو مولانا شبلی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کے طاقتور قلم کے کے مقابلے میں پیش کرنے کے لئے پاس کیا ہوگا؟

نشرِ حسینیت اور پیغام و مقصدِ حسینی کی تبلیغ کی تحریک

بلا خوف و تردد پوری دنیائے اسلام میں ایک صدی میں کسی ایک عالم نے واقعہ کر بلا اور امام حسینؑ کی سیرت اور کارناموں پر اتنا زیادہ اور اتنا عظیم کام پیش کیا ہے جتنا آیۃ اللہ العظمیٰ علی نقوی مرحوم نے انجام دیا ہے۔ سید العلماء پہلے شخص ہیں جنہوں نے نہ فقط شیعوں کو جواب تک صرف مصائبِ امام حسین علیہ السلام سنتے تھے، مقاصدِ حسین علیہ السلام سے آگاہ کیا بلکہ غیر اقوام کو امام حسین علیہ السلام کی شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرایا۔ سرکارِ سید العلماء نے تنہا حسینیت پر اتنا لٹریچر فراہم کر دیا جو بہت سے ادارے مل کر نہ کر سکے۔ آئندہ حسینیت کا جو بھی مطالعہ کرنا چاہے گا وہ

سید العلماء کی تحریروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ماضی میں بھی یہی ہوا ہے، یہاں تک کہ آپ کے دشمن بھی جب چاہتے تھے کہ من مانی داستان پر دازیوں کی ڈگر سے ہٹ کر امام حسین علیہ السلام کی سیرت یا کارناموں کے بارے میں کوئی نکتہ پیش کریں تو سید العلماء ہی کے رسالوں اور کتابوں سے سرتہ کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ”چوری اور سینہ زوری“ کی پرانی مثل پر عمل پیرا تھے۔

حسینیت کی نشر و اشاعت کے لیے جتنا سید العلماء نے لکھا اس دور کے کسی عالم اور مفکر نے نہیں لکھا ہے۔ کر بلا فہمی اور امام حسین علیہ السلام شناسی کے سلسلے میں سید العلماء کی تصانیف پر ایک طائرانہ نظر ہی یہ نکتہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۱) شہید انسانیت (۲) مجاہدہ کر بلا (۳) قاتلان حسینؑ کا مذہب (۴) شہدائے کر بلا (۵) اسوہ حسینی (۶) خطبات کر بلا (۷) عزائے حسینؑ پر تاریخی تبصرہ (۸) عزائے حسینؑ کی اہمیت (۹) عزائے مظلوم (۱۰) کر بلا کا تاریخی واقعہ مختصر ہے یا طولانی (۱۱) کر بلا کی یادگار پیاس (۱۲) مجسمہ انسانیت (۱۳) مظلوم کر بلا (۱۴) مقصد حسینؑ (۱۵) نفسِ مطمئنہ (۱۶) یادو یادگار (۱۷) یزید اور جنگِ قسطنطنیہ (۱۸) شہید کر بلا (۱۹) سرا براہیم و اسماعیلؑ (۲۰) شہید کر بلا کا سال بہ سال ماتم (۲۱) سرور شہیداں (۲۲) عظمت حسینؑ (۲۳) حیات جاوداں (۲۴) مقصد حسینؑ (۲۵) تاریخ اسلام میں واقعہ کر بلا کی اہمیت (۲۶) استقامت علی الحق کا معیاری نمونہ (۲۷) اسیری اہل حرم (۲۸) اشکِ ماتم (۲۹) اگر واقعہ کر بلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا (۳۰) امام حسینؑ کی شہادت اور دستور اسلامی کی حفاظت (۳۱) بنی امیہ کی عداوت اسلام کی مختصر تاریخ (۳۲) بین الاقوامی شہید اعظم حسینؑ بن علیؑ (۳۳) تعزیرہ داری کی

مخالفت کا اصل راز (۳۴) حسینؑ اور اسلام (۳۵) حسینؑ اور ان کا پیغام (۳۶) حسینؑ اور قرآن (۳۷) حسینؑ حسینؑ: ایک تعارف (۳۸) حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام (۳۹) حسینی اقدام کا پہلا قدم (۴۰) خلافت یزید کے متعلق آزاد رائیں اور ضمیر کی آوازیں (۴۱) دیں پناہ است حسینؑ (۴۲) ذوالجناح (۴۳) زندہ جاوید کا ماتم (۴۴) سامانِ عزاء (۴۵) شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ (۴۶) شبِ شہادت (۴۷) شجاعت کے مثالی کارنامے (۴۸) شہادت حسینؑ کے اسباب (۴۹) شہادت زار کر بلا (۵۰) شہید کر بلا کی خاندانی خصوصیات اور فداکارانہ روایات (۵۱) شہید کر بلا کی یاد کا آزاد ہندوستان سے مطالبہ۔

یہ تمام عنوان نہیں بلکہ کر بلا اور امام حسین علیہ السلام کے متعلق ان کی بعض تحریروں کے عنوانات ہیں۔

سید العلماء نے حسینؑ فہمی اور کر بلا کے کارنامے کو متعارف کرنے کے کام کو ایک وسیع اور جاندار تحریک کی شکل میں شروع کیا۔ اور اس عظیم واقعہ کو روشناس کرانے، تحریفات سے بچانے اور زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے منظم جہاد شروع کیا۔

آپ نے اپنے جہاد کو مندرجہ ذیل خطوط پر استوار کیا۔ (۱) واقعہ کر بلا کو اس کے صحیح خدو خال میں پیش کیا جائے۔ عربی کی بنیادی کتابوں سے اخذ کر کے ہندستانی زبانوں میں واقعات پیش کیے جائیں تاکہ عام آدمی بھی ان سے مستفیض ہو سکے۔

(۲) عزاداری محض مصیبتِ حسینؑ کا تذکرہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ مقصد حسینؑ سے لوگوں کو روشناس کرانے کا ذریعہ ہو۔

(۳) واقعہ کر بلا محض یزید کے افتاد طبع اور اس کی حیوانی جبلتوں کا نتیجہ نہ قرار پائے بلکہ پورے تاریخی تسلسل کے ساتھ دو متضاد قوتوں کے ٹکراؤ کا، حق و باطل کی معرکہ آرائی کا شاہکار بن کر ذہن انسانی کے سامنے آئے۔

(۴) اس طرح کسی ایک فرقہ یا مذہب سے مخصوص کرنے کے بجائے حسین علیہ السلام کو اعلیٰ انسانی اقدار کا نمائندہ اور محافظ قرار دیتے ہوئے پوری نوع انسانی سے منسوب کیا جائے۔ اس پس منظر میں اعلیٰ اقدار کے تحفظ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی شخصیت ”شہید انسانیت“ کی صورت میں سامنے آتی ہے، ایسا ”شہید انسانیت“ کہ جو تاریخ میں تہا نہیں رہ جاتا بلکہ جس کا جذبہ ایثار و قربانی لوگوں کو تحریک عمل دیتا ہے اور آنے والی نسلوں پر ناقابل فراموش اثرات مرتب کرتا ہے۔

(۵) اس طرح امام حسینؑ کو امام باڑوں میں محدود کرنے کے بجائے انسانی اقدار کی بلندی اور عظمت کے کامل شاہکار کی حیثیت سے پوری نوع انسانی سے متعارف کرانا، تاکہ تعلیمات محمدیؐ کا یہ مجسم پیکر لوگوں کے دلوں کو پیغام محمدیؐ کی برتری اور افادیت کے آگے جھکنے پر مائل کر دے اور اقوام عالم تک اسلام کی تبلیغ کا موثر ترین عامل قرار پائے۔

آپ نے اپنے تبلیغی جہاد کو اس حکمت عملی کے ساتھ شروع کیا کہ حسینیت کا پیغام کتب خانوں تک محدود نہ رہ جائے۔ لہذا بجائے ضخیم کتابیں لکھنے کے آپ نے چھوٹے چھوٹے کتابچے تصنیف کیے تاکہ بچے بھی آسانی کے ساتھ ان کو پڑھ اور سمجھ سکیں۔ آپ نے دیگر مسالک اور مذاہب کے افراد کو بھی اس موضوع پر لکھنے کی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ ”امامیہ مشن“ کی مطبوعات میں ایسی بہت سی تصانیف شامل ہیں۔

آپ کی سعی جمیلہ نے جہاں آپ کو حسینیت کا مبلغ اعظم اور سب سے بڑا داعی بنادیا، وہیں شیعہ قوم کی تاریخ میں ایک بدنما باب کا اضافہ کر دیا۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے عزاداری کو محض رونے رلانے کا ذریعہ اور ذاکری کو ایک پیشہ قرار دے رکھا تھا، وہ کہ جنہوں نے دین و شریعت اور تاریخ سب ہی کو اپنی خواہشات کے پیکر میں ڈھال رکھا تھا، سید العلماء کے تحقیقی اور استدلالی طریقہ کار کو برداشت نہ کر سکے ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ اگر سید العلماء کی تبلیغ یوں ہی جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ جب ہمارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ان کو اس بات کا خطرہ سامنے نظر آنے لگا کہ ہم نے جس عزاداری کو اب تک لوگوں کو شریعت سے دور رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا وہی عزاداری اب لوگوں کو دین و شریعت کی جانب رہنمائی کرنے والی بن جائے گی۔

اس طرح جہاں ایک جانب ۱۳۶۱ھ کی مناسبت سے سید العلماء اس کام میں منہمک تھے کہ واقعہ کر بلا کی تیرہ صد سالہ یادگار کے طور پر ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس میں حسینؑ کا رنامے پر ہر جہت سے بھرپور روشنی ڈالی جائے، وہیں بے عمل علماء اور ان کے جاہل پیروؤں کا ایک گروہ سازشوں کا جال بننے میں لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ کہ جو انبیاء اور آئمہ معصومینؑ پر جھوٹ اور افترا باندھنے میں کوئی تکلف نہیں محسوس کرتے تھے وہ بھلا سید العلماء اور کتاب ”شہید انسانیت“ پر کیچڑ اچھالنے میں کیا پس و پیش کرتے۔ پھر جب اپنے موقف کی حمایت کے لیے بے عمل اور پیشہ ور ذاکروں کی ٹولی موجود ہو تو کیا کہنے ہیں۔ اس پر سے ستم بالائے ستم یہ کہ عوامی مزاج اس مثل کا مصداق ہو کہ ”کو اکان لے گیا۔ تو کوئے کے پیچھے دوڑ گئے اور کان ٹول کر نہیں دیکھا کہ ہے یا نہیں۔“

لانا عدیل اختر صاحب مرحوم نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا اور سید العلماء نے کتاب کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔

واقعہ کربلا کے متعلق جو کتاب وجود میں آئے وہ تاریخی اعتبار سے اتنی صحیح ہو کہ ہر مکتبہ خیال کے افراد اس سے اتفاق فرمائیں اور اس میں کسی طرح کی خامی اور کمی رہنے نہ پائے، اس بنیادی خیال کو پیش نظر رکھ کر جب مسودہ کتاب شہید انسانیت شائع ہوا تو ٹائٹل پیج کی پشت پر سب سے پہلے بیان حال کی سرخی کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی گئی (ناواقف حضرات کو انتہائی غور کے ساتھ اس عبارت کو پڑھنا چاہیے):

”یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ کے سلسلے میں واقعہ کربلا کے اسباب، حالات اور نتائج کے متعلق جس کتاب کا اعلان ہوا ہے اس کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی۔ مگر عملی صورت سے یہ صورت غیر ممکن ثابت ہوئی کہ تمام ارکان مجتمع ہو کر اس کی ترتیب میں حصہ لیں۔ اس لئے تمام مضامین اور عناوین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادارہ کی جانب سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے۔ اور اب اس کو طبع کرا کر تمام ایڈیٹوریل بورڈ کے ارکان اور منتخب اہل قلم کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ ان حضرات سے گزارش ہے کہ اس کتاب کے تمام اجزاء کا نظر غائر سے مطالعہ کریں اور جس مقام پر اضافہ کی ضرورت ہو یا کمی لازم ہو یا ترتیب کا بدلنا مناسب معلوم ہو، وہاں اپنا نوٹ تحریر فرمادیں اور اس کتاب کے ان کے پاس پہنچنے کے بعد ایک ماہ کے اندر اپنی زیریں رائے سے ادارہ کو مستفید فرمائیں تاکہ ان کے آرا اور قیمتی مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کی آخری تدوین و ترتیب کا کام انجام پائے اور پھر اس کتاب کی وسیع اشاعت کی جائے۔“ والسلام

کتاب چاہے آٹھ صفحات کی ہو یا آٹھ ہزار ورقوں کی،

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم اس طرح قوم میں تفرقہ اور انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ ہماری ان کاوشوں سے سید العلماء کی شخصیت کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، حسینیت کی تبلیغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

یہ سید العلماء کی شخصیت کا تابناک پہلو ہے کہ وہ مخالفین کی تمام ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں عزم کا ایک کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ ہاں! یہ آنے والی نسلیں ہیں کہ جو حالات کا تجزیہ کریں گی اور حیرت و استعجاب سے پوچھیں گی کہ آخر سید العلماء کا کیا قصور تھا؟ وہ تعجب کریں گے کہ آخر قوم کو بنیادی امور سے کیوں بے خبر رکھا گیا۔ کیوں نہیں بتایا گیا کہ سید العلماء نے روایات کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے بنیادی کتابوں سے تحریر کیا تھا۔ اپنی طرف سے نہ کچھ گھٹایا تھا نہ کچھ بڑھایا تھا۔

قضیہ ’شہید انسانیت‘

سیرہ صد سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں منائی گئی تھی، اس یادگار منانے کے مقصد میں ایک مقصد بلکہ سب سے بڑا مقصد واقعہ کربلا پر ایک مبسوط کتاب کا شائع کرنا تھا۔ چنانچہ اس کتاب کی تدوین کے لئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل کی گئی تھی۔ اس بورڈ کی متعدد میٹنگوں کا انعقاد کیا گیا۔ مگر ممبر حضرات نے کبھی زحمت نہیں فرمائی۔

بالآخر ایک میٹنگ میں مرحوم عدیل اختر صاحب جو اس وقت مدرسۃ الواعظین کے پرنسپل تھے۔ یہی کہوں کہ اتفاقی طور پر آگئے، ایڈیٹوریل بورڈ کے صاحبان علم کی بے توجہی کو دیکھتے ہوئے مولانا عدیل اختر صاحب نے سید العلماء سے فرمایا کہ آخر اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس پر سید العلماء نے فرمایا کہ صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں کتاب لکھ کر بورڈ کی میٹنگ میں استصواب رائے کے لئے پیش کر دوں۔ مو

ادارے کے کسی ذمہ دار شخص نے، ادارہ کے کسی ممبر نے ارادنا، سہواً، کنایتاً کسی اخبار، کسی رسالہ، کسی ہینڈ بل کسی پوسٹر یا خود مسودہ 'شہید انسانیت' میں کہیں بھی یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب حرف آخر ہے۔ اس کا حرف قرآن و حدیث ہے یا یہ عام پبلک کے لئے شائع کی گئی ہے۔

ضمیر کی جو کثافت ہے اس کو دھو اے شیخ

وگر نہ مجھ کو بتا مقصد وضو کیا ہے

ابھی تک حقیقتاً یہ بالکل پرائیوٹ اور نجی مسودہ کتاب تھا۔ ادارہ کی منظوری کے بعد جب یہ تمام دنیا کے لئے شائع کی جاتی اس وقت ناقدین کو اس پر نقد کرنے کا پورا پورا حق ہوتا۔ اس لئے محل تنقید سے عناد، کینہ، بغض، حسد، مخالفت بلکہ صاف صاف کہوں کہ دشمنی کا کھلا ہوا اظہار ہوتا ہے۔ جسے ظلم سے تعبیر کرنا بالکل صحیح ہوگا۔ جب تک کوئی کتاب مسودے کے شکل میں ہوتی ہے اس وقت تک وہ نظیر کے طور پر پیش نہیں کی جاسکتی۔ مخالفت برائے مخالفت کرنے والوں کے علاوہ ہر صاحب عقل ناظم شعبہ تصنیف کے 'بیان حال' کی عبارت پڑھنے اور سننے کے بعد کبھی بھی اس کتاب کو مجوزہ کتاب کی آخری اور مستند شکل نہیں سمجھے گا۔ اس کو چھاپا ہی اسی لئے گیا تھا کہ اس کی خامیوں سے ادارہ کو مطلع کیا جائے۔

اس مسودہ کے جتنے جتنے جزو چھپتے جاتے تھے وہ ایڈیٹر ریل بورڈ کے ممبروں اور اہل بصیرت کی خدمت میں روانہ ہوتے رہتے تھے۔ اس مسودہ کے چھپنے میں کئی مہینے لگ گئے تھے۔ معترض اگر نیک نیت ہوتے تو جتنا جتنا مسودہ ان کے پاس پہنچتا رہتا تھا۔ وہ اپنی رائے سے ادارہ کو مطلع کرتے رہتے۔ مگر انھیں تو سید العلماء کے خلاف سازشی محاذ قائم کرنا تھا۔ اس لئے سب چپ سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مسودہ

کتاب کا سب سے زیادہ نمایاں صفحہ اس کا سرورق یعنی ٹائٹل پیج ہوتا ہے۔ ہر خریدار اور ہر پڑھنے والے کی سب سے پہلے اور سب سے پہلی نظر ٹائٹل ہی پر پڑتی ہے۔ مسودہ 'شہید انسانیت' کے سرورق پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مسودہ مخصوص ایڈیٹر ریل بورڈ کے ارکان اور منتخب اہل قلم کے لئے (ہے) اس کا مطلب کیا اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ یہ مسودہ ابھی ادارہ کے حدود میں مقید ہے۔ ابھی یہ عام نہیں کیا گیا ہے۔

یہ ٹائٹل پیج والی عبارت ڈھکے چھپے انداز سے خفی خط میں بال کی اتنی باریک نہیں ہے۔ یہ اتنے جلی حرفوں میں لکھی ہوئی ہے کہ ضعف بصر والے حضرات کو بھی پڑھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوگا۔

ادارہ اور ناظم شعبہ تصانیف تو یہ لکھ رہے ہیں، مگر جماعت شیعہ کے بڑے بڑے عبا و قبا والوں نے بجائے اس کے کہ ادارہ کو اپنے مفید مشوروں سے مطلع کرتے جس کے لئے انھیں مفت کتابیں بھیجی گئیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے بھیجنے کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے اس مسودہ 'شہید انسانیت' کو فائل کتاب قرار دے کر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر ڈالا۔ اس مقدس جماعت کے افراد جو اپنے کو نائب امام گردانتے ہیں۔ ان کی نیک نفسی، پاک باطنی، راست گوئی، ایمانداری، اور خوش نیتی، کا کیسا عظیم مظاہرہ آنکھوں کے سامنے آیا ہے۔ کیا افراط تقدس کا تقاضا یہی ہے ۔

چو کفر ز کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

دل میں اگر بدی ہے تو اے شیخ و برہمن

یہ زحمت نماز یہ پوجا فضول ہے

ادارہ یادگار حسینی کی مجلس عمل نے، ادارے کے صدر

نے، ادارے کے سکریٹری نے، ناظم شعبہ تصنیف نے،

کتابی شکل میں آگیا تو اس وقت بہت ہی منظم طرح پر ہر گھاٹ سے چوکس ہو کر پروپیگنڈہ مشینری حرکت میں لائی گئی۔

مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم کا ہندوستان گیر اثر تھا۔ اس اثر سے کام لیا گیا۔ عزا میں شیعہ رؤسا ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم کے ذریعہ سے ذاکرین کو اپنے یہاں بلواتے تھے۔ اس بنا پر ذاکروں کی تعداد کثیر اس خانوادہ سے منسلک تھی۔ ان ذاکروں کو آلہ کار بنایا گیا۔ شیعوں میں اخبار ہی کتنے ہیں۔ اس وقت کے جو چند اخبار تھے ان کے ایڈیٹروں کو رام کیا گیا۔ اب کیا تھا۔ تقریر و تحریر دونوں ذریعوں سے سید العلماء کے خلاف سارے ہندوستان میں آگ لگادی گئی۔ جرمنی کے سب سے بڑے پروپیگنڈسٹ گوئی بلز کے قول کے مطابق جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کو اتنا دہرایا جائے کہ دنیا انھیں سچ سمجھنے لگے۔ چنانچہ یہاں یہی کیا گیا، عوام و خواص سب اس جال میں پھنس گئے۔

ان دنوں ایک انکشاف یہ بھی ہو رہا تھا کہ جس کو دیکھتے وہ مفتی اعظم بنا ہوا ہے، خود ساختہ عالموں، نام کے مولویوں پیشہ ور ذاکروں، تاجروں شاعروں، وکیلوں اور نہ معلوم کس کس طرح کے لوگوں کے فتوے ”سرفراز اخبار“ میں شائع ہو رہے تھے۔ ان میں بیشتر تو ایسے ہوں گے جن سے اہم مسائل علمیہ تو درکنار بالکل ہی الف، ب، والی بات یہ پوچھ دیجئے کہ: واجبات وضویا واجبات نماز کیا ہیں؟ تو بغلیں جھانکنے لگیں، اور زبان گنگ ہو جائے۔

لگے ہاتھوں اس گروہ کا ایک کارنامہ اور لکھ دوں۔ یہ وہ جتنا ہے جو بظاہر امام حسینؑ کی محبت کا دم بھرتا ہے اور اپنے کو حد درجہ مذہبی ظاہر کرتا ہے اس نے شیعوں کے ایک جلسہ عام میں جو امام باڑہ آصفی میں سید اصغر حسن جج کی صدارت

میں ہوا تھا جسے بہت ہی نمائندہ جلسہ کہا گیا تھا جس میں عوام کے ساتھ ساتھ خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد بتائی گئی تھی۔ اس میں مسودہ ”شہید انسانیت“ پھاڑ کر اس کے کچھ پرزے ہوا میں منتشر کئے گئے تھے۔ کچھ کوجوتوں سے روند اگیا تھا اور کچھ کو نذر آتش کیا گیا تھا۔

یہ خولی، شمر اور یزید والا کام اس کتاب کے ساتھ کیا گیا جس میں قرآنی آیتیں تحریر ہیں، جس میں خدا کے آخری رسولؐ اور ائمہ علیہم السلام کے ناموں کے ساتھ ان کے اذکار بلند درج ہیں جس میں بیت رسولؐ کی مخدرات عصمت و طہارت کے حیر العقول کارناموں کا تذکرہ ہے، جس میں جاں نثاران حسینؑ کی بلند کرداری اور ان کی عظیم الشان لا جواب قربانیاں منظر عام پر لائی گئی ہیں، جس میں امام حسینؑ کا حق بات پر قائم رہنے کا عظیم النظیر واقعہ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے، جس کی کوئی دوسری مثال صحن عالم میں دکھائی نہیں دیتی۔ خود مسودہ شہید انسانیت واقعہ کر بلا پر ایسی جید کتاب ہے جیسی آج تک شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہو۔

جنوں کا یہ نہیں ایما کہ گلشن ہی جلا ڈالو

مجان چمن دیوانگی کی بھی کوئی حد ہے

کیا ایسی کتاب کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہئے تھا؟ کیا اختلاف ظاہر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی تھا؟ کیا رسولؐ اور آلؑ رسولؐ کے ساتھ محبت کے ظاہر کرنے کا یہی تقاضا تھا؟ کیا قرآنی آیتوں کا احترام اسی طرح کرنا چاہئے تھا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عمل کے کرنے والے اور اس عمل سے اتفاق رکھنے والے مسلمان اور خصوصیت سے صحیح معنوں میں شیعہ کہے جاسکتے ہیں؟ کیا انسانیت، آدمیت، تہذیب، اخلاق مذہب، اور احکام الہی اس عمل کو حق بجانب

قرار دے سکتے ہیں؟ ایسوں پر خدا نفرین اور ایسوں کی خدا ملامت ضرور کرے گا۔

متعدد مرتبہ یہ بات درمیان میں لائی گئی کہ ذمہ دار حضرات ایک ساتھ بیٹھ کر کافی فکر و تجسس کے بعد طے کر لیں کہ واقعہ کربلا سے متعلق کیا لکھا جائے، اور کیا نہیں لکھنا چاہئے۔ اس انتہائی مناسب بات پر مقدسین کے سرکندھوں کی جانب داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی طرف گھومتے ہی رہے۔ واقعہ کربلا سے متعلق کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے اس کی فکر کس کو ہے؟ فکر کا مرکز تو بس ایک ہی ہے کہ سید العلماء کے خلاف کیا کیا جائے کہ وہ ساری قوم میں بایں علم و دانش غیر ہر دل عزیز ہو جائیں۔

بہر حال انتہائی ہنگامی حالات اور حد کی مکدر فضا میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۵ء کو ادارہ یادگار حسینی کی میٹنگ کا انعقاد محمود آباد ہاؤس 'قیصر باغ' لکھنؤ میں کیا گیا۔

حالات بہت پر ہول تھے۔ شدید ٹکراؤ کا یقین تھا۔ اس طوفان کو سکون میں بدلنے کے لئے سید العلماء نے مسودہ 'شہید انسانیت' جس کو ادارے کے لئے مرتب کیا تھا اسے واپس لے لیا۔ ادارے نے بھی اسے کالعدم قرار دے دیا۔ اس سے میٹنگ میں ٹکدر کی نوبت نہیں آئی۔ اب یہ مسودہ تنہا سید العلماء کی ملک ہو گیا۔

جیسا کہ مسودہ 'شہید انسانیت' کے صفحہ دو پر تحریر ہے۔ اس کے مطابق مسودہ پر نظر ثانی کی گئی ملاحظہ ہو۔ اصل کتاب شہید انسانیت کے سرورق کے پشت کا "پیش لفظ"، بفضل الہی اب اس کی توفیق سے وہ ہنگام آ گیا کہ 'شہید انسانیت' اصل کتاب کی شکل میں منظر عام پر لائی جاسکی۔ کتاب کے "مسودہ" کی بغرض استصواب اشاعت کے بعد جن افراد نے

نرم گرم مختلف لہجوں اور تعمیری و تخریبی صورتوں سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا، وہ سب ہی شکر یہ کہ مستحق ہیں اور اس ایڈیشن میں اصل مقاصد کتاب اور نشر حسینیت کے اہم مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے جہاں تک ممکن تھا، ان سب کا لحاظ کیا گیا۔ والسلام

علی نقی الحقوی عفی عنہ

مخالفت کا بنیادی سبب

ایک مشہور خانوادہ کا علمی چراغ ایک مجتہد کے مرحوم ہونے سے گل ہو گیا۔ جس سے اس پر گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی۔ ہندوستان کی علمی قیادت ہی کہی جائے جو کسی طرح اس گھر سے متعلق ہو گئی تھی وہ اب بجا طور پر سید العلماء کے علم و فضل کی بنا پر ان کی طرف پوری طاقت سے منتقل ہو رہی تھی، گھر کی ساری رونق، عزت، دولت، سب اسی مذہبی لیڈری کے بل پر تھی۔ اس کا جانا قیامت آنے سے کم نہ تھا اس کو اپنے گھر سے وابستہ کرنے کے لئے سارا ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ یادگار حسینی کے عظیم سے عظیم تر ادارے کو آگ لگائی گئی۔ یہ نیک کام بظاہر سید العلماء کی مخالفت میں کیا گیا تھا، مگر حقیقت میں یہ مذہب دشمنی کے ساتھ ساتھ کھلی ہوئی، امام حسینؑ سے دشمنی تھی۔

سیاسی سوجھ بوجھ تو بہر حال تھی ہی۔ ظاہر ہے اگر اتحاد ہو جاتا تو ان حضرات کا وجود 'شہید انسانیت' کے شائع ہونے سے پہلے علمی اور مذہبی دنیا میں جیسا تھا ویسا ہی رہ جاتا۔ یہ منصب جلیل اختلاف ہی کے ہاتھوں حاصل ہوا۔ ہندوستان کے جید ترین شیعہ دینی عالم کے مقابل ان حضرات کے ناموں کا آنا اتحاد کی صورت میں کہاں ممکن تھا۔ یہ بلندی بڑی جاں فشانہ بڑی کاوش اور زور کثیر صرف کر کے حاصل کی گئی ہے۔ نواب صاحب رام پور کے کہنے سے اسے ہاتھ سے دے دینا

اپنے کو بے نام و نمود کرنا ہوتا۔

سید العلماء کے حریفوں کی علمی بلندی یہ تھی کہ اہم موضوع پر مستند کتابیں لکھنا تو درکنار چلتے پھرتے پندرہ بیس کتابچے ہی اپنی ساری عمر میں لکھ دیتے تو بھی کہنے کو کچھ تو ہو جاتا۔ فقہی معلومات کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی نے کسی مسئلہ کے متعلق فتویٰ لینا چاہا تو یہ ہمیشہ کنائی کاٹ جایا کرتے تھے۔

ایسی قابلیت کے لوگوں میں اپنے کو سید العلماء سے بہتر اور برتر ثابت کرنے کا امکان ہی نہیں تھا اس لئے یہ ترکیب سوچی گئی کہ شیعوں کی دکھتی رگ پکڑ کر سید العلماء پر ایسی الزام تراشیاں کی جائیں جس سے ساری قوم بدحواس ہو کر ایسے الجھاوے میں پڑ جائے کہ اس کو کسی طرح دوسری طرف توجہ مبذول کرنے کا موقع ہی نہ ملے یہی ایک صورت ہے جس سے مذہبی قیادت اپنے گھر ہی سے وابستہ رہ سکے گی۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ سید العلماء کے خلاف ساری فضا زہر آلود کردی گئی۔

جس طرح برسات کی راتوں میں کروڑوں حشرات الارض کے بغیر سوچے سمجھے جلتے ہوئے بلب کی روشنی پر ایک ساتھ حملہ آور ہونے سے دیکھنے والوں پر ان کی طاقت کی ایک چھوٹ پڑتی ہے، وہ بیشک پڑی۔ جس مقصد کے لئے پروپیگنڈہ کیا تھا اس سے مخالفین کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ شیعہ عوام کی اکثریت سید العلماء سے برگشتہ کردی گئی۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ائمہ کی تاسی میں سید العلماء کی خاموشی سے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ اگر کمزوری نہ ہوتی تو خاموشی کیوں اختیار کی جاتی۔ اس کھلی چھوٹ کے ملنے سے پروپیگنڈے کو اور طاقت حاصل ہو گئی اور وہ اپنی انتہا کو پہنچا دیا گیا۔

اگر کوئی خالی پوشاک کا عالم ہو جیسے کہ آج کل تقریباً سب

ہی ہیں تو وہ کب کا پیوند زمین ہو چکا ہوتا۔ مگر سید العلماء خدا رسیدہ انسانوں کی طرح اپنے جادہ پر کوہ گراں کی طرح قائم رہے۔ ایک پھل جھڑی تھی جو چھوٹ کر رہ گئی۔ نہ چاند پر کوئی خاک ڈال سکا، نہ سورج سے کوئی آنکھیں چار کر سکا۔ کروڑوں پتنگوں کے حملہ آور ہونے سے بھی بلب کی روشنی کی چمک دمک پر کوئی اثر نہیں پڑا، وہ اسی طرح ضیاء باری کرتا رہا، اسی طرح روشن رہا، اس طرح تاریکی کو پھٹکنے نہیں دیا۔ نتیجے میں ان کیڑوں مکوڑوں کی اکثریت فنا کے گھاٹ اتر گئی اور جو باقی رہے انھوں نے حسب معمول اپنے لیڈروں کی طرح راہ فرار اختیار کر لی۔

مخالف گروہ کے جن افراد کی طرف میں نے متعدد مرتبہ توجہ مبذول کرائی ہے انھوں نے اپنی ساری زندگی میں کوئی بھی مذہبی و دینی کام نہیں کئے، قوم کی فلاح و بہبود کی کوئی راہ نہیں نکالی، ان حضرات نے کوئی بھی تعمیری کام نہیں کیا البتہ تخریبی دوکارنامے تو بالکل سامنے کے ہیں، ایک افتراق بین المسلمین دوسرے سید العلماء جن کے دینی و مذہبی، جماعتی کاموں کی انتہا نہیں ہے، ان کے ہر کام کی مخالفت کرنا۔ وقتی طور پر اپنے اثر و رسوخ کی بنیاد پر جتنی چاہیں بغلیں بجالیں۔ خدا کسی کی نیکیوں، بھلائیوں اور عظیم کاموں کو ضائع ہونے نہیں دیتا، کچھ ہی دنوں کے بعد جب یہ بادل چھٹیں گے تو ان ہٹ دھرم بے عمل افراد پر ہر طرف سے خوب ہی خوب لے دے ہوگی۔

ماپوس کس لئے ہو پرستارِ راہ حق

باطل کی فتح ہوتی ہے کچھ دیر کے لئے

خطابت

کسی مذہب اور کسی فرقے میں علماء و افاضل کی کبھی کوئی

جنگ عظیم کے موقع پر تبدیل ہوا تھا۔ سید العلماء ایک بجے تک ظہرین سے فارغ ہو کر ایک گھنٹہ وعظ فرماتے تھے اور پھر ٹھیک دو بجے یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔

اس ایک گھنٹہ میں علم و عرفان کی کیسی بارش ہوتی تھی، میں کیا بتاؤں؟ میں تو اس وقت دیکھنے والوں، سننے والوں اور تعریف کرنے والوں کی نظریں دیکھتا تھا اور محظوظ ہوتا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ شعور میں بالیدگی آتی گئی اور میں پوری طرح لطف اندوز ہونے لگا۔

سخن شناس اور سخن سنج مجمع کے سامنے سید العلماء کا وعظ، وعظ میں مختلف علوم کا ذکر اور ان میں علمی گوشے، معقولات و منقولات کی بحث اور بیچ بیچ میں کسی خاص مسئلہ یا نکتہ کی وضاحت کے لیے مجمع میں سے کسی کا سوال کرنا اور جواب معقول پا کر سر جھکا لینا، یہ وہ باتیں ہیں جو اب دیکھنے اور سننے کو نہیں ملتیں۔

یہاں پر ایک بات اور عرض کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جس طرح واقعہ کربلا کی بنیاد سقیفہ بنی ساعدہ میں پڑ چکی تھی اسی طرح یہ بات بھی بلا خوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ سید العلماء سے بغض و عناد کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں اس وقت پڑ چکی تھی جب شاہ جارج پنجم نے انتقال کیا تھا اور انگریزوں کے پٹھو علماء نے وثیقہ داران اودھ کے نام سے امام باڑہ آصفی میں ایک مجلس ترجمہ کی۔ اس خلاف شرع مجلس کی اجازت دینے کے لئے ”علمائے کرام“ کے دستخط سے جو محضر شائع کیا گیا تھا اس پر سید العلماء نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”حضور عالی! غور تو فرمائیے۔ اس پر سرکار۔۔۔۔۔ نے دستخط اور مہر ثبت فرما کر اجازت دے دی ہے، اب آپ کیوں عذر فرما رہے ہیں؟“

”وہ ان کا فعل ہے۔ اس کے وہ ذمہ وار ہیں، میرے

کمی محسوس نہیں کی گئی۔ لیکن ایسے علماء و افاضل کی ضرورت کی محسوس کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ جو بیک وقت تقریر و تحریر پر برابر کا ملکہ رکھتے ہوں۔ اپنی اس بات کو برصغیر تک محدود رکھتے ہوئے، میں یہ کہوں گا کہ اس صدی کے علماء اسلام میں یہ صفت صرف دو ہستیوں میں ملتی ہے جنہیں تحریر اور تقریر میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سید العلماء مولانا سید علی نقی النقی، بات مزید سمیٹ کر صرف علماء شیعہ تک محدود کر لی جائے تو ہمیں صرف ایک ہی نام ملے گا۔ ”سید العلماء مولانا علی نقی“۔

میں نے سید العلماء کے مواعظ میں اس وقت سے شرکت شروع کی جب میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سن و سال میں کسی تقریر کو اور اس کے موضوع کو سمجھنا میری قوت و طاقت سے باہر تھا۔ لیکن سید العلماء کے ذہن رسا، طبع خدا واد اور فکر عالی میں ڈھلے ہوئے الفاظ و نکات اور علمی موشگافیاں جب حاضرین سنتے تھے، تو پھر ٹک اٹھتے تھے، نعرہ ہائے تحسین و تعریف اور صلوة کے پیہم نعرے مجھ پر بھی وجد کی کیفیت طاری کر دیتے تھے۔

اور یہ تعریف و توصیف کچھ ”ایسے ویسوں“ کی نہیں تھی، نہ اس زمانے میں آج کل کے رکیک انداز تھے کہ اپنے کچھ پٹھوؤں کو منبر کے سامنے بٹھایا کہ وہ تعریفوں کے پل باندھیں۔ آیت پڑھی (سبحان اللہ) ترجمہ پڑھا (واہ واہ) موقع محل ہو کہ نہ ہو، تعریف و توصیف سے کام۔

میں یہ باتیں ۱۹۳۴ء کے آس پاس کی عرض کر رہا ہوں۔ رمضان المبارک کا زمانہ ہے، مسجد نمازیوں سے چھلک رہی ہے۔ تنگی و اماں کی شکایت کر رہی ہے۔ اس زمانہ میں نماز ظہرین ٹھیک ساڑھے بجے ہوتی تھی۔ ایک بجے کا وقت

نزدیک ایسی مجلس میں شرعی قباحت ہے۔“

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماتھے تو جہی سے ٹھکنے لگے تھے، جبینوں پر شکنیں جہی سے پڑنے لگی تھیں، اس پر خطابت کا یہ انداز کہ شہر کا ہر پڑھا لکھا ہر محفل میں بس انہی تقریروں کے چرچے کرتا اور سردھننا نظر آ رہا تھا۔ اے روشنی طبع تو برمن بلا شادی

ہاں ایک بات اور یاد آئی کہ شاہ جارج کی مجلس ترجم میں کچھ علماء سیاہ دوپٹے پہن کر اور کچھ اپنے بازوؤں پر سیاہ بٹے باندھ کر شریک ہوئے تھے۔ جس پر کچھ منشرع اور ثقہ حضرات نے دبی زبان سے اعتراض بھی کیا تھا۔ ”دینے فروختی و چارزاں فروختی“

پٹی باندھنے کا یہ شوق ان کے اخلاف اور تابعین میں بھی آیا، فرق صرف یہ تھا کہ رنگ بدل گیا تھا۔

خطابت کے سلسلے میں ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ سید العلماء مرحوم ایک اعلیٰ پائے کے ذاکر اور محقق تھے۔ ذاکر کا پایہ اور مرتبہ واعظ سے کم ہے۔ لیکن یہ سید العلماء کا ہم جیسے لوگوں پر احسان عظیم ہے کہ انھوں نے اپنے مرتبہ سے ایک زینہ نیچے اتر کر ذاکری بھی اختیار کی، ہمیں سمجھانے کے لیے، ہمارے دلوں کو حب اہل بیت سے مملو کرنے کے لیے۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف برصغیر ہندوستان کو اپنے علم کے بحر ذخار سے سیراب ہونے کا موقع دیا، بلکہ پیرانہ سالی میں صعوبت سفر برداشت کر کے غیر ممالک بھی تشریف لے گئے۔

مرحوم نے ایک بار فرمایا تھا:

”معاندین نے خواہ مخواہ مجھے نزاعی شخصیت بنا دیا۔ اور مجھے ذاکری پر مجبور کر دیا ورنہ اگر میں گوشہ عافیت میں بیٹھ کر

اپنی قوم کے خطیبوں، ذاکروں اور مناظرہ بازوں کے لیے مواد فراہم کر کے دیتا اور اس کے ذریعہ وہ دین حقہ کی خدمت کرتے اور مخالفین کا مسکت و دندان شکن جواب دیتے تو یہ دین کی بڑی خدمت ہوتی۔“

مگر پیشہ ور اور بے سواد ذاکرین بھلا اس پر کان کیوں دھرتے، ان کو اس کے لیے پڑھنا پڑتا۔ مطالعہ کرنا پڑتا۔ کتب خانوں میں جانا پڑتا۔ بھلا اتنا وقت ان کے پاس کہاں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ منبروں کی تقدیس ختم ہو گئی اور نشر علوم اہل بیت رک گیا۔ ان بے سواد ذاکروں نے بس مسئلہ خلافت اور مسئلہ فدک کی بعض روایتیں اور واقعات، کتاب ”مسئلہ خلافت و امامت“ سے پڑھ لیں اور ان پر تقریریں رٹ کر شہر بہ شہر اور دیار بدیار پہنچنا شروع کر دیں ایک ہی تقریر بمبئی، کلکتہ، مدراس، کانپور، کناڈا، آسٹریلیا، لندن، امریکا سب جگہ ”گا ہک دیکھ کر پڑیا پاندھنے“ کے انداز پر بکیں اور کوٹھیاں کھڑی ہو گئیں۔

بہر حال بات سید العلماء کی خطابت کے متعلق ہو رہی ہے۔ ان کے افادات پر مشتمل جو چھوٹے چھوٹے رسالے امامیہ مشن نے نکالے انھوں نے ان بے سواد ذاکروں کی کس طرح مدد کی اس ذیل میں ایک واقعہ سن لیجئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ سید العلماء نے کتنے پتے کی بات فرمائی تھی۔

بمبئی میں مشہور اخبار نویس اور مقرر جناب ذاکر حسین صاحب فاروقی مرحوم نے ایک صحبت میں فرمایا تھا:

”لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب جو مولانا نقی صاحب کی مخالفت میں پیش پیش ہیں، میرے ساتھ افریقہ کے سفر میں ساتھ تھے، پانی کے جہاز سے سفر ہو رہا تھا۔ طوفان سے جہاز میں سامان ادھر ادھر ہو گیا۔ مولانا اپنی بیٹی اٹھا کر لائے اور

سامان ٹھیک کرنے کے لیے کھولی، جو سامان سے کچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جیسے ہی انھوں نے پٹی کھولی، مولانا نقن صاحب کے رسالے جو اوپر ہی رکھے ہوئے تھے، پٹی سے باہر نیچے گرے۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا اور پھر حیرت زدہ ہو کر مولانا سے پوچھا: مولانا یہ کیا؟ فرمانے لگے کیا کروں، ریڈی میڈ میٹر کہاں سے لاؤں؟

واضح رہے کہ راوی مرحوم بر بنائے مصلحت اسی جرگے کے ساتھ تھے جو سید العلماء کے خلاف تھا۔ مجتہد صاحب زندہ ہیں، تصدیق کی جاسکتی ہے۔ ”عمیاں راجہ بیاں“ افسوس کہ غم روزگار اور ضیق وقت خیالات کو مجتمع کرنے اور یادداشت کو تازہ کرنے کا موقع نہیں دیتا ورنہ مجھ جیسا، ہچکچاہٹوں سے کم خطابت ہی کی صفت پر ایک چھوٹی موٹی کتاب مرتب کر سکتا ہے۔

افسوس صد ہزار افسوس کہ آفتاب درخشندہ فضل و کمال غروب ہو گیا، تاہم بہت سے ”شپرہ چشم“ مولویوں کو روشنی عطا کر گیا ہے اگر انھوں نے بھی ”ریڈی میڈ“ میٹر سے کام لیا تو اپنی دکان ضرور چمکائیں گے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات!

تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

جب شہید ہوتا ہے زمزم آشنا کوئی

(حضرت سید العلماء علیہ الرحمہ کی وفات پر)

علامہ عقیل الغروی

غرق ہو گیا دریا ریت کے سمندر میں
سنگلاخ ساحل پر ٹھٹ کا ٹھٹ کھڑا مجمع
تشنگی زدہ مجمع اپنے ہاتھ پاؤں کی
گرد پھانک کر جی لے عکس آب ہی پی لے

بس شراب ہی پی لے قطرہ قطرہ پانی کی
ذرہ ذرہ پر چھائیں دائرے بناتی ہے
آندھیاں اٹھاتی ہے چشمہ ہائے شیریں کو
ریت سے چھپانے کی سعی زشت کرتی ہے
زندگی تڑپتی ہے موت رقص کرتی ہے
پیاس مسکراتی ہے جاں بہ لب صداقت جب
ایڑیاں رگڑتی ہے چشمہ پھوٹ پڑتا ہے
صبر و استقامت سے گرد حلقہ بنتا ہے
باپ اور بیٹے کی پاکی ریاضت سے
کوئی کعبہ بنتا ہے پیاس مسکراتی ہے
خاک ہو زمانے کی خاک آفرینی پر
جو نگار ہستی کو خاک ہی بتاتی ہے
نور و نار آب و رنگ سب کو خاک کہتی ہے
جاں بہ لب صداقت کے جاوداں نشانوں پر
علقہ و زم زم پر خاک ڈال دیتی ہے
کیا فریب کرتی ہے معجزہ نما ہستی
سحر دہر کو پھر بھی فاش کر ہی دیتی ہے
فاش کر کے رہتی ہے خاک کے ہیولوں پر
خود ہی خاک پڑتی ہے پھر نکلتا ہے زم زم
پھر حبیج آتے ہیں پھر طواف ہوتا ہے
ہاں مگر یہ دل میرا پھر بھی ڈوب جاتا ہے
جب شہید ہوتا ہے زم زم آشنا کوئی

